اسلام کے جانباز

فرخ امرتسری

قیمت دو روپے [illegible] آنے

ناشران۔ لائن پریس لاہور

اسلامی تاریخ کا تابناک باب۔ فدا کارانِ اسلام
کا حریت افروز منظریہ۔ میدان کارزار کا تہور خیز
نقشہ۔ چلتی تلواروں اور تڑپتی ہوئی لاشوں کا
ہیبت ناک نظارہ۔ فتوحاتِ اسلامی کا شاندار
اور معنی خیز صحیفہ۔

از

منشی غلام قادر فرخ امرتسری

نیازمند اپنی ناچیز مساعی کے نوشگفتہ پھول

جو

خونِ دل کے رنگ و بو سے مہکتے ہوئے

صفحۂ قرطاس پر آئے ہیں

نہایت خلوص و احترام سے

اُن بے شمار جانبازوں کی لافانی رُوحوں

پر

نثار کرتا ہے

جنہوں نے دین و ملت کے قیام و بقا کی خاطر

نمارد وزہستی میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا

فرخ

فہرست مضامین

بدرگاہِ ربّ العالمین

یا الٰہی! اگر ہی یہ؟ وشتِ دہشت ناک میں
ہم بھٹکتے پھر رہے ہیں جادۂ منزل سے دُور
وہ ضمیرِ حق پرستی ہو گیا ہوا خاموش کیوں؟
قربِ باطل ہے پسند اب تھے کبھی باطل سے دُور
وا ہے امواجِ تلاطم زا میں حسد کا مِ نہنگ
جا رہے ہیں شورشِ طوفان میں ساحل سے دُور
ہو گیا ہے سردسوزِ جذبۂ پروانگی
مثلِ دُودِ شمعِ افسردہ ہوئے محفل سے دُور
الحذر! دِل میں نہیں شوقِ شہادت کی تڑپ
جاں نکلتی جا رہی ہے خنجرِ قاتل سے دُور

ہو رہی ہے طعمۂ مور و ملخ کشتِ امل
ہم غمِ بربادیٔ حاصل میں ہیں حاصل سے دُور

آہ! رنجِ بے دلی نے کر دیا بے دِل ہمیں
دِل ہوا ہے ہم سے دُور اور ہم ہوئے ہیں دِل سے دُور

کہہ رہی ہے قیسِ بیدل سے نسیمِ آہ سرد
طالبِ لیلےٰ ابھی ہے ناقۂ محمل سے دُور

در صراطِ زندگی گردِ سرِ راہے شدیم
پائمالِ رہرواں مثلِ پرِ کاہے شدیم

وہ بھی دن تھے۔ ماسوا اللہ کی اُلجھن نہ تھی
منکشف ہم پر ہُوا تھا عقدۂ رازِ احد

ہم مٹے بھی تو غبارِ راہِ "اللہ ہُو" ہوئے
آ رہی تھی خاک کے ذرّوں سے آوازِ احد

"ایک ہے بے مثل ہے۔ میرا خدا ہے لاشریک"
جاں بلب ہو کر بھی کہتا کشتۂ نازِ احد

اب صنم ہیں جا بجا۔ ہر گھر بنا بُت خانہ ہے
ہو گیا آنکھوں سے پنہاں حُسنِ اعجازِ احد

کیوں ہوئے ہیں بربطِ "لا" کے ترانے دلپذیر

نغمۂ اِلّا کہاں؟ اور ہے کہاں سازِ اَحَد
ہو گئے شاہیں بچے محبوس دامِ بے خودی
محوِ حیرت ہے عقابِ تیز پروازِ اَحَد
ہو رہی ہے نام پر اسلام کے تبلیغِ کفر
مُبتلائے شرک ہیں مردانِ جانبازِ اَحَد
پھر عطا ہم بے پروں کو طاقتِ پرواز کر
پاک ہو زاغ و زغن سے ارضِ شہبازِ اَحَد
شورِ "غیر اللہ" سے فرخ فضا معمور ہے
دم بخود ہیں طوطیانِ نغمۂ پردازِ اَحَد
حق پرستاں را عطا جانبازئ منصور کن
فتنۂ اصحابِ فیل از کعبۂ ما دور کن

فرخ

ڈٹے رہے - جب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے - اُن کے دل سے ہر دم یہ صدا نکلتی تھی ؎

دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

بےشمار بہادر ایسے گذرے ہیں، جنہوں نے میدانِ جدال و قتال میں جامِ شہادت نوش کیا - دشمنوں کے نرغے میں آئے، غلام ہو کر بِکے، مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی - دشمنوں نے ہولناک مظالم کئے - لرزہ خیز ایذائیں دیں - لیکن اُن کے دِل ذرا متزلزل نہ ہوئے - ان کے بدن نیزوں سے چھلنی ہوئے - اور وُہ ـــــ خدا ایک ہے ـــ خدا ایک ہے ـــ پکارتے رہے -

انہی لوگوں کی قربانی، جاں نثاری، اور مجاہدانہ اولعزمی نے اسلام کو دنیا میں لازوال صورت میں پیش کیا

حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں غازیانِ اسلام کی سرفروشانہ پیروی نے بدترین دشمنوں کو ایسی شکست دی - کہ چند سال میں اُن کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ـــــ نہ ابوجہل رہا، نہ ابولہب - اور نہ اُن کے معاون و مددگار باقی رہے خالد - ابوالعاص، اور ابوسفیان جیسے جری سالارانِ کفار کو اسلام

کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ عمرؓ جیسے جابر نے بھی قرآن کی ایک آیت سن کر کلمہ شہادت پڑھا۔

حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد امیر معاویہ کے آغوش میں پلے ہوئے یزید نے آنحضرت صلعم کے نواسے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور اُن کی اولاد پر انتہائی مظالم برپا کئے۔ یہ گویا کفر اور اسلام کی جنگ تھی۔ اور یزید کا خوفناک حملہ دینِ فطرت کو معدوم کرنے کا پُرخطر اقدام تھا۔ اگر حضرت امام اس کی اطاعت قبول کر لیتے اس کے ہاتھ میں دستِ بیعت دے دیتے۔ تو گویا عظمتِ اسلام کا خاتمہ تھا۔ حضرت امام نے سمجھ لیا۔ کہ اُن کی موت دائمی زندگی ہوگی یزید نے بھی اس جورِ ناروا کا انجام یہ سوچا۔ کہ اب عرب اور ممالک ملحقہ میں اس کی حکومت ہوگی۔ وہ شرعی قیود اور خدائی احکام سے بے نیاز ہو کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرے گا۔ مگر بقول کسے۔ ع

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

یزید مر گیا۔ اور حسینؓ نے بقائے دوام کا شرف حاصل کیا۔ حسینؓ کے خون نے نخلِ اسلام کو سینچا۔ وہ کربلا کے ریگ زار میں پھوٹا اور فضائے عالم پر چھا گیا۔

قرنِ اولیٰ کے یہ واقعات درسِ حیات ہیں۔ ہمارے نوجوانوں

کے لئے، جو ذرا سی تکلیف سے گھبرا جاتے، اور اسلامی شعائر کے انحراف پر تُل جاتے ہیں۔

اسلامی تاریخ کے اوراق ایسے خونیں واقعات کے افکار سے رنگین ہیں۔ بیشمار فرزندانِ اسلام نے دین کے احیا و بقا کے لئے مردانہ وار اپنی جانیں نثار کیں۔ جب کبھی کفر کی زبردست آندھیاں آئیں۔ اور شمعِ توحید کو گل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لاکھوں جاں نثار پروانے آموجود ہوئے۔ اور اپنی جانیں قربان کر دیں۔ کسی زمانے کو دیکھو کسی دَور کا جائزہ لو۔ کب اسلام پر لرزہ خیز حملے نہیں ہوئے اور کب اُن کے دفاع کے لئے سرفروش بہادر سینہ سپر ہو کر میدان میں نہیں آئے۔ انہی جانبازوں کے اُولُو العزمانہ کارناموں نے اسلام کی عظمت کا ڈنکا چار دانگِ عالم میں بجایا۔ قیصر و کسریٰ کے غرور و تکبر کو کس نے خاک میں ملایا۔ انہی مجاہدانِ اسلام نے۔ اِن خداؤں کی حکومت پر کس نے تسلط جمایا؟ پرستارانِ توحید نے زردشت کے آتش کدے کس نے سرد کئے؟ مسلمانوں کی تیغِ آبدار نے۔ لات و منات کے بُت کس نے توڑے۔ سومنات کا بُت کس نے پاش پاش کیا۔ بُت خانوں میں نعرۂ تکبیر کس نے بلند کیا انہی صحرا نشینوں نے جو عرب کے ریگستان سے اُٹھے۔ اور

یورپ افریقہ اور ایشیا کے بڑے بڑے ملکوں میں پرچم اسلام لہرا کر اپنا مقدس فرض بجا لائے۔ انہوں نے اور انکے اولوالعزم جانشینوں نے صدیوں تک اُن وسیع و بسیط ممالک پر حکومت کی۔

ٹھیک تیرہ سو سال کے بعد نہ وہ رُوحِ اسلام رہی، نہ وہ ولولۂ ایمان۔ انحطاط کا دور آیا۔ دشمنانِ اسلام نے تمام دُنیا میں اپنی طاقت، سیاست اور دولت سے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ یورپ کی بہت سی ریاستیں چھین لیں۔ افریقی مقبوضات پر ہاتھ صاف کیا۔ وسط ایشیا پر اپنا تسلّط جمایا۔ ہندوستان کو اپنے دام میں اسیر کیا۔

غرضیکہ وہ اسلام جن کے نام سے تیرہ سو سال قبل دُنیا کے قاہر و جابر فرمانروا کانپتے تھے۔ اب ہر کس و ناکس کے تیرِ جفاء کا نشانہ بن گیا۔ یہ کیوں؟ مسلمان فرمانرواؤں کی مطلق العنانی۔ آرام طلبی اور عیش پسندی اور عامۃ المسلمین کے باہمی افتراق، سہل انگاری اسلام اور روایاتِ اسلام سے بے پرواہی و بیگانگی کے باعث!

اگست ۱۹۴۷ء کے ہولناک واقعات ہمارے سامنے ہیں مشرقی پنجاب میں جدال و قتال کا بازار گرم ہوا۔ جا بجا کربلائی مناظر دیکھے گئے۔ پندرہ لاکھ فرزندان اسلام و خواتینِ ملت کا قتل عام ہوا

ان کی جائدادیں چھن گئیں۔ عزت و حرمت برباد ہوئی۔ اور جو باقی رہے
انہیں خانہ بدوشی کی مصیبت برداشت کرنی پڑی۔

مگر بہت کم لوگ تھے جن میں قربانی کا جذبہ بروئے کار تھا۔
جنہیں اسلامی غیرت ملحوظِ خاطر تھی۔ وہ پاکستان آئے اور مہاجر و پناہ گیر
کہلائے۔ جہاں آئے انہوں نے انصار کا فرض ادا نہ کیا ــــــــ

مہاجر انصار کو کوسنے لگے۔ اور انصار نے مہاجرین پر زہر اگلا۔

اگر صحیح اسلامی روح ہم میں موجود ہوتی۔ اور ایک ہزار کے
مقابلے ۳۱۳ کی فتحیابی کا جذبہ دلوں میں کارفرما ہوتا۔ تو ہمارا سیلاب
دریائے راوی کی طرف رُخ کرنے کی بجائے نئی دہلی کی طرف جاتا۔
اور گنگا جمنا میں طوفان برپا کر دیتا۔

آہ! آج لال قلعہ کا تصور ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔
جامعہ شاہجہان اور قطب مینار کی تصویریں دیکھ کر سرد آہیں بھرتے
ہیں۔ اور تاج محل کی دائمی محرومی پر اشکِ حسرت بہاتے ہیں۔

فرزندانِ اسلام! اس کتاب میں مسلمان بہادروں کے حالات
پڑھو۔ اپنے ماضی کو یاد کرو۔ اپنا حال دیکھو اور مستقبل کو ایسا شاندار بناؤ
جیسا آج سے تیرہ سو سال پہلے تھا۔

نیازمند
فرخ امرتسری

لاہور پاکستان
یکم جون ۱۹۵۱ء

اِسلام کے جانباز

مجاہدِ اعظم

جب تمام دنیا میں کفر کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا عرب خاص کر تمام برائیوں کا مسکن تھا۔ اس وقت ایک ایسے مجاہد کی ضرورت تھی جو شرک کی تاریکیوں کو کافور کر کے وحدانیت کی ظلمت پاش شمع روشن کرے۔ جس نورانیت سے تمام دنیا جگمگا اُٹھے۔ چنانچہ خداوندِ کریم نے حضرت رسولِ اکرم کو دنیا میں بھیجا اور ایسے شہر میں آن کا نزولِ اجلال ہوا۔ جہاں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا تعمیر کردہ خانہ کعبہ بتوں کا گھر بنا ہوا تھا۔ سب خدا کو بھول چکے تھے۔ اور جو خدا کا نام لیتا تھا۔ اس کی جان کی خیر نہیں تھی۔ اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا تھا۔

حضرت محمد صلعم چالیس برس تک حالات کا معائنہ کرتے عوام کے انسانیت سوز اعمال کو دیکھتے اور تزکیہ نفس میں مصروف رہے۔ جب آپ اپنی قدرتی تعلیم کی تکمیل کر چکے تو خدا تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعے نبوت کا شرف عطا فرمایا۔

اِس مژدہ جانفزا سے سب سے پہلے اُم المومنین حضرت خدیجہؓ آنحضرت کی زوجہ محترمہ متاثر ہوئیں۔ انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ، پھر آنحضرت کا غلام زید اور حضرت ابوبکرؓ صدیق مشرف باسلام ہوئے بعد ازاں حضرت عثمانؓ حضرت زبیرؓ۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف دینِ فطرت کے حلقہ بگوش ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ بہت سے لوگ حضرت پیغمبرِ خدا کی نبوت پر ایمان لائے۔

لیکن جب آفتابِ اسلام کی روشنی پھیلنے لگی۔ اور اس کی تیز کرنیں کفر کے سینے کو تیروں کی طرح چھیدنے لگیں تو کافر تڑپ اُٹھے اور اس پر پردہ ڈال لینے کے لئے میدان میں نکل آئے۔ اور اس شمع ہدایت کو پھونکوں سے بجھانے کی مضحکہ خیز حرکات کرنے لگے۔

تین سال تک تو چپکے چپکے خاموشی سے پوشیدہ طور پر اسلام کی تبلیغ ہوتی رہی۔ لیکن جب آپ نے کھلم کھلا عوام کو راہِ راست

پر آنے کی تلقین شروع کی۔ تو تمام قبیلۂ قریش ان کا دشمن ہو گیا آنحضرت کے ماں باپ تو پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ دادا عبدالمطلب بھی رحلت کر گئے۔ ان کے بعد چچا ابوطالب نے کفالت اختیار کی۔ قبیلۂ قریش کے سربرآوردہ لوگوں نے اُن پر دباؤ ڈالا۔ کہ وہ اپنے بھتیجے کو منع کریں۔ اور اس کے عوض وہ جو چاہیں۔ ہم انہیں دینے کے لئے تیار ہیں۔ ہم اپنے بتوں کی مذمت برداشت نہیں کر سکتے۔ ابوطالب نے بہت سمجھایا۔ اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا۔ تو آنحضرت نے نہایت تحمل اور ادب سے جواب دیا:۔

"اے چچا! خدا کی قسم۔ اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند لا کر دیں تو بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ یا تو اسلام پھیل کر رہے گا۔ یا میں خود اس پر قربان ہو جاؤں گا"

یہ الفاظ آنحضرت نے اس جوش اور خلوص سے کہے کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ابوطالب نے آپ کی یہ کیفیت دیکھ کر کہا:۔

"اے میرے عزیز! جو دل چاہے کرو۔ میں تمہارا ساتھ ہرگز نہ چھوڑوں گا"

آپ کا استقلال اور عزم دیکھ کر حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہ بھی اسلام لے آئے۔

جب قریش نے دیکھا کہ اسلام پھیل رہا ہے اور معمولی مخالفت سے اس کا رکنا محال ہے تو سب قبائل نے جمع ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ ہاشمی خاندان کو ایک جگہ محصور کر کے تباہ و برباد کیا جائے۔ نہ کوئی ان سے ملے۔ نہ کوئی چیز ان کو کھانے کے لئے دی جائے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے۔ جب تک وہ محمد (صلعم) کو ہمارے حوالے نہ کر دیں۔

یہ نبوت کا ساتواں سال تھا۔ آنحضرت اور اُن کا خاندان تین سال ایک پہاڑ کے درہ میں محصور رہے۔ اور کافروں نے ہر طرح تکلیفیں دیں۔

جب رسولِ خدا وعظ فرمایا کرتے۔ تو ابولہب (چچا) ساتھ ساتھ کہتا جاتا تھا۔ کہ "یہ جھوٹ کہتا ہے۔" راہ چلتے آپ پر کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا۔ آپ کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔

ایک دفعہ آپ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ عقبہ نے آپ کی گردن میں چادر لپیٹ کر بڑے زور سے کھینچا۔ ایک دفعہ آپ سجدے میں تھے۔ آپ کے سر پہ ایک کافر نے اوجھ ڈال دی۔

طائف میں تبلیغ کے لئے گئے اور وعظ فرمانے لگے۔ تو ایک شخص نے بلند آواز سے کہا "خدا کو تیرے سوا کوئی اور آدمی نہ ملتا تھا" اور طرح طرح کی پھبتیاں اڑانے لگے۔ اس پر ہی بس نہ کی بلکہ کافروں نے شہر کے بدمعاشوں کو اُبھارا ـــــــ وہ راستے کے دونوں طرف قطاریں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ جب آپ ان کے درمیان سے گذرے۔ تو انہوں نے آپ کے پاؤں پر پتھر برسانے شروع کئے۔ آپ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے۔ تو وہ بدبخت آپ کا بازو تھام کر کھڑا کر دیتے اور کہتے کہ ـــــــ "جاؤ۔ یہاں تمہارے ٹھہرنے کا کیا کام ہے۔" جب پھر چلتے تو پتھر مارتے۔ گالیاں دیتے اور تالیاں بجاتے۔ پتھروں کی بوچھاڑ اس قدر ہوئی کہ آپ کی جوتی لہو لہان ہو گئی۔

ایک دفعہ خباب نامی مسلمان نے کافروں کے مظالم سے تنگ آکر عرض کیا۔ کہ آپ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں کرتے ـــــــ یہ سن کر آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا ـــــــ تم سے پہلے ایسے لوگ گذر چکے ہیں۔ جن کے سروں پر آرے چلائے گئے۔ جن کو چیر کر دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ جن کی کھال کھینچی گئی۔ لیکن وہ پھر بھی اپنے فرض سے باز نہ آئے۔ خدا کی قسم! اسلام پھیل کر رہے گا"

کافروں کے ظلم سے تنگ آکر آپ نے مدینہ کو ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ کافروں کو بھی علم ہوگیا۔ رات بھران کے مکان کا محاصرہ کر رکھا۔ اور قتل کے لئے چند ایک آدمی متعین کر دیئے۔ لیکن آپ اس رات حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا کر وہاں سے چلے گئے۔ کوہ نور میں پہنچے۔ وہاں حضرت ابوبکر صدیق نے پہلے ہی ایک غار صاف کر رکھی تھی۔ اور آپ سو گئے۔

جنگ اُحد میں آپ دشمنوں کے نرغے میں گھر گئے۔ کسی کافر نے پتھر مارا۔ اور آپ کا دانت شہید ہوگیا —— پھر عبداللہ بن قمیّہ نے چہرہ مبارک پر تلوار ماری۔ اس سے خود کی دو کڑیاں چہرہ مبارک میں چبھ گئیں —— جو حضرت ابو عبیدہ بن جراح نے دانتوں کے زور سے نکالیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے زخم لگے ——

لیکن آپ جاں نثاروں کے حلقے میں نہایت استقلال سے کھڑے یہ کہتے رہے۔

"اے خدا! میری قوم کو بخش دے —— کیونکہ وہ نہیں جانتے۔"

زمانۂ نبوت سے لے کر آخری عمر تک آنحضرت نے جو جو مصائب برداشت کئے، اور جو جو تکلیفیں اُٹھائیں۔ زبانِ قلم اُن کے بیان کرنے سے قاصر ہے۔

کسی موقعہ پر ایک صحابی بہت مضطرب ہوا۔ اور دشمنوں کے شور و شر سے گھبرا گیا۔ آپ نے اُسے تلقین کی:۔

"گھبراؤ مت۔ اسلام پھیل کر رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک سوار حضرہ موت تک سفر کرے گا اور اُسے خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو گا۔"

بحضور خیر البشر

گھنے اندھیرے میں چاند بن کر فضاؤں کو جگمگانے والے
کوئی دمکتی کرن ادھر بھی، نظر نظر میں سمانے والے
وہ رحمتوں کا جمال سادہ تری جبیں سے برس رہا ہے
پلک پلک جن کو چومتے ہیں تجھے دلوں میں بسانے والے
تری محبت کی چاندنی میں ہزار منزل نکھر چکی ہے
مگر بڑھے جا رہے ہیں ترے خیال سے لَو لگانے والے
نظر نظر تلملا اٹھی ہے۔ اداس راہوں کی الجھنوں سے
کوئی اشارہ قدم قدم شمع رہ گزر بن کے آنے والے
یہ دَور بھی تیرے بعد دیکھا بشر نہیں مطمئن بشر سے
تڑپ رہے ہیں تڑپنے والے ستا رہے ہیں ستانے والے
غلط سیاست کے معبدوں میں سنہرے معبود کون پوجے
بس ایک جلوہ، ہر اک زمانے میں بت شکن بن کے آنے والے
حضور حضور ہے سکوتِ دریا، مٹا مٹا ہے نشان ساحل
ترے سوا اب کسے پکاریں ترے لئے جی سے جانے والے

(قتیل شفائی)

صدیقِ اکبرؓ

حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفۂ اوّل۔ بڑے بہادر۔ بے خوف اور ان حق پرست لوگوں میں سے جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ کفار کے بے پناہ حملوں اور اُن کے زہرہ گداز مظالم کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا۔ آپ آنحضرت صلعم کے مخلص جان نثار اور ہر مرحلے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

ہجرت کی رات جب آنحضرتؐ کوہِ ثور پہ پناہ گزیں ہوئے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ غار کو خوب صاف کیا اور اس کے تمام سوراخ اپنا کپڑا پھاڑ پھاڑ کر بند کئے۔ ایک سوراخ باقی رہ گیا۔ جب آپؐ سو گئے۔ تو اس سوراخ کے آگے اپنی ایڑی رکھ دی۔ سانپ نے کاٹ لیا۔ مگر حضرت صدیقؓ نے

اُف تک نہ کی - اور ایڑی وہاں رہنے دی - جب آنحضرت بیدار ہوئے - تو آپ تکلیف میں تھے - پوچھا "یا ابوبکر صدیقؓ کیا بات ہے - وجہ بتائی - تو حضورؐ نے جائے ماؤف پر لب لگایا - اور درد جاتا رہا -

ایک جنگ کے موقعہ پر مالی ضرورت پیش آئی - تو سب صحابہ نے حسب استطاعت امداد دی - مگر حضرت ابوبکر صدیق نے اپنا سب کچھ لا کر حضرت کے قدموں پر ڈال دیا - جب پوچھا ——— اپنے لئے بھی کچھ رکھا؟ ——— تو جواب دیا ——— "میرے لئے خدا اور خدا کا رسول کافی ہیں"

حضرت رسولِ خدا کی وفات کے بعد آپ جب مسندِ خلافت پر بیٹھے - تو بیشمار مشکلات درپیش تھیں - مگر آپ ان سب پر غالب آئے -

جھوٹے مدعیانِ نبوت - مرتد اور باغی - منکرینِ زکوٰۃ وغیرہ کا قلع قمع کر کے میدان صاف کیا -

حضرت اسامہ کی مہم شام کی طرف روانہ ہوئی - تو حضرت ابوبکر صدیق مصاوحت کے لئے پیدل اسامہ کے گھوڑے کیساتھ ساتھ چلنے لگے - اسامہ نے کہا "یا امیر المؤمنین! آپ گھوڑے پر سوار

ہوں۔"

فرمایا ——— "میں نہ گھوڑے پر سوار ہوں گا۔ اور نہ تم کو اترنے کی اجازت دونگا۔"

"سرحدِ شام پر عیسائیوں کا زور دیکھ کر ایک زبردست لشکر روانہ کیا۔ قیصر ہرقل شہنشاہ روم خود مقابلے میں آیا۔ جنگ میں رومیوں کے ۲۰ ہزار آدمی مارے گئے اور مسلمانوں کے ۳ ہزار شہید ہوئے۔ اس شکست سے قیصر روم کو سخت صدمہ ہوا۔ اور وہ حمص سے جاتے وقت یہ کہتا گیا۔ "اے شام! تجھ کو میرا آخری سلام۔"

حضرت ابوبکر صدیق نہایت رحم دل، خیر اندیش اور نیک طبیعت تھے۔ حضرت رسولِ خدا کے بعد صرف سوا دو سال خلافت کا جو کام انجام دیا۔ وہ کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا۔

۱۔ اسلام کی تبلیغ۔

۲۔ سلطنت کی توسیع۔

۳۔ بغاوت وغیرہ کا انسداد۔

نزع کے وقت اسلام کی محبت دل میں بیقرار اور کلمہ طیب زبان پر تھا۔

صدیقؓ

اِک دن رسولِؐ پاک نے اصحابؓ سے کہا
دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مال دار
ارشاد سن کے فرطِ طرب سے عمرؓ اُٹھے
اُس روز اُن کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور
بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
لائے غرض کہ مال رسولِ امیں کے پاس
ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار
پوچھا حضور سرورِ عالم نے اے عمرؓ!
اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟
مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گذار
کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا،
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ صفا سرشت
ہر چیز جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار
ملکِ یمین و درہم و دینار و رخت چین
اسپ قمر سم و شتر و خاطر و حمار
بولے حضور، چاہئیے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا۔ وہ عشق و محبت کا راز دار
اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار
" پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا و رسول بس "

(علّامہ اقبال)

کفار کے وحشیانہ مظالم

پہلی قربانی

فدا کارانِ اسلام کی تعداد جب چالیس سے اوپر ہو گئی۔ تو آنحضرتؐ نے کعبہ میں جا کر اعلان کر دیا "خدا ایک ہے۔ اللہ کا کوئی شریک نہیں۔"

وہ کافر جو ۳۶۰ بتوں کو خدا مانتے تھے۔ ایک خدا کی آواز سن کر بھڑک اٹھے۔ اور رسولؐ خدا پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے یہ دیکھ کر حارث بن ابی حالہ بچانے کے لئے آگے بڑھے۔ تو ظالموں نے اِدھر اُدھر سے ان پر تلواروں کے اتنے وار کئے۔ کہ وہ شہید ہو گئے۔ یہ پہلی قربانی تھی۔ جو اسلام کی بقا کے لئے راہِ خدا میں پیش کی گئی۔

بے رحم بھائی

حضرت عمرؓ ابھی مشرف باسلام نہ ہوئے تھے۔ اُنہیں معلوم ہوا۔ کہ اُن کی بہن فاطمہ اور اس کا خاوند سعید دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ وہ شمشیر بکف فوراً اُن کے گھر پہنچے۔ فاطمہ قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ عمرؓ کو دیکھ کر فوراً قرآن شریف کے ورق چھپا دیئے اور خاموش ہوگئیں۔

عمرؓ نے پوچھا۔ "تو کیا پڑھ رہی تھی؟"

بولیں:- "کچھ نہیں"

عمرؓ کہنے لگے:- "میں نے سُنا ہے۔ تم دونوں مرتد ہوگئے ہو"۔ یہ کہہ کر بہنوئی کو پکڑ لیا۔ جب فاطمہ بچانے کو دوڑیں تو اُسے اس قدر مارا کہ غریب لہو لہان ہوگئیں۔ لیکن اسلام کی رُوح ان کے رگ و ریشہ میں سما چکی تھی۔ انہیں ایسی سختیوں کی کیا پروا تھی۔ فاطمہ نے پکار کر کہا:-

"اے عمرؓ جتنا زور چاہو لگا لو۔ اسلام ہمارے دل سے نہیں نکل سکتا"۔

اُن لفظوں کا اثر عمرؓ کے دل پر بے حد ہوا۔ بہن کی طرف نگاہ

کی۔ تو اس کے بدن سے لہو جاری تھا۔ یہ دیکھ کر ان کا دل بھی نرم ہو گیا اور کہنے لگے "جو تم پڑھتے تھے۔ مجھے بھی سناؤ۔"

فاطمہ نے قرآن کے ورق لا کر سامنے رکھ دیئے۔ عمرؓ اٹھا کر پڑھنے لگے۔ جوں جوں پڑھتے جاتے تھے۔ اُن کے دل پر اثر ہوتا جاتا تھا۔ جب اس آیت پر پہنچے "خدا اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ۔" فوراً پکار اُٹھے:۔

اشھد ان لا الہ الا اللہ

(میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں)

ایمان کی آزمائش

آنحضرتؐ کے بڑے بڑے صحابہ پر قریش کا کوئی بس نہ چلتا تھا۔ اور جانتے تھے کہ وہاں سے اینٹ کا جواب پتھر ملے گا لیکن جو مسلمان کمزور تھے۔ اُن پر انہوں نے طرح طرح کے ظلم کئے غریب مسلمانوں کو پکڑتے تیز دھوپ میں گرم ریت پر لٹاتے چھاتی پر بھاری پتھر رکھتے۔ کہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ جلتی ریت "بدن" پر بچھاتے۔ گرم لوہے سے جسم داغتے اور پانی میں غوطے دیتے

حضرت بلالؓ۔ قریش کے ایک مشہور رئیس اُمیّہ کے غلام تھے۔ وہ انہیں ٹھیک دوپہر کے وقت گرم ریت پر لٹاتا۔ سینے پر بھاری پتھر رکھتا۔ اور کہتا۔ کہ اسلام سے پھر جا۔ لیکن بلالؓ یہی کہتے:۔

"خدا ایک ہے ——— خدا ایک ہے"

جب اس طرح وہ اسلام سے نہ پھرے۔ تو اُمیّہ نے اُن کے گلے میں رسّی باندھی۔ لونڈوں کے حوالے کیا۔ کہ انہیں شہر میں گھسیٹتے پھریں۔ لیکن وہ پھر بھی زبان سے "اَحَد ——— اَحَد" (خدا ایک ہے۔ خدا ایک ہے) پکارتے تھے۔

عمارؓ بن یاسر:۔ ایک بے یار و مدد غریب الوطن تھے۔ دنیاوی وجاہت بھی حاصل نہ تھی۔ والدہ سمیّہ ابھی غلامی سے آزاد نہ ہوئی تھی۔ اس کے باوجود جوشِ ایمان سے مجبور ہو کر اسلام کا اعلان کر دیا۔ مشرکین نے ان کے خاندان کو لاچار و مجبور دیکھ کر سب سے زیادہ تختۂ مشقِ ستم بنایا۔ طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ دوپہر کے وقت تپتی ریت پر لٹایا۔ دہکتے ہوئے انگاروں سے جلایا۔ گھنٹوں پانی میں غوطے دیئے۔ لیکن اتنی سختیوں کے باوجود اسلام پر قائم رہے۔

سمیّہ کو ابوجہل نے اپنے نیزے سے وحشیانہ طور پر شہید کیا۔ تاریخِ اسلام میں یہ دوسری عبرت ناک شہادت تھی جو ایک ضعیف العمر عورت کو نصیب ہوئی۔

والد حضرت یاسر اور بھائی حضرت عبداللہ بھی کفارِ مکہ سے اذیتیں اٹھاتے اٹھاتے اپنے مولا سے جا ملے۔

ایک دفعہ حضرت عمار کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا۔ آنحضرت اس طرف سے گزرے۔ تو اُن کے سر پہ دستِ مبارک پھیر کر فرمایا۔

"اے آگ! تو ابراہیم کی طرح عمار پہ ٹھنڈی ہو جا۔"

جب آپ اُن کے گھر کی طرف سے گذرتے اور خاندان کو مبتلائے مصیبت دیکھتے۔ تو فرماتے۔

"اے آلِ عمار! تمہیں بشارت ہو۔ جنت تمہاری منتظر ہے۔"

ضعیفی کے عالم میں جن لوگوں نے حضرت عمار کی پیٹھ ننگی دیکھی تھی۔ وہ بیان کرتے ہیں۔ کہ اِس وقت تک کثرت سے سیاہ لکیریں۔ تپتی ہوئی ریت اور دہکتے ہوئے انگاروں کے داغ اُن کی پیٹھ پر موجود تھے۔

خباب - ایک مسلمان تھے۔ قریش نے کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے۔ اور اُنہیں کوئلوں پر چت لٹا دیا۔ ایک شخص اُن کی چھاتی پہ چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ کہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ جب تک کوئلے پڑے پڑے ٹھنڈے نہ ہو گئے۔ انہیں لٹائے رکھا۔

صہیب کو قریش نے سخت ایذائیں دیں۔ اُن کو اس

قدر مارتے کہ اُن کے حواس میں فرق آجاتا۔ اور انہیں یہی کہتے
کہ اسلام سے پھر جاؤ۔ مگر وہ کب مانتے تھے۔ جب یہ بیچارے
ہجرت کر کے مدینے کو چلے۔ تو کافروں نے ان کا تمام مال و اسباب
ضبط کر لیا۔

ابو فکیہہ کے پاؤں میں اُمیہ نے رسّی ڈالی۔ اور آدمیوں
کو کہا کہ اسے گھسیٹ کر لے جائیں اور گرم ریت پر لٹائیں راستہ
میں جب انہوں نے اُمیہ سے کہا ــــــــ "کہ میرا اور میرا خدا
اللہ تعالیٰ ہے"۔ تو ظالم اُمیہ نے ان کا گلا اس زور سے دبایا
کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا۔ ایک دفعہ ان کے سینہ پہ اتنا بھاری
پتھر رکھا۔ کہ اُن کی زبان باہر نکل آئی۔

حضرت عثمان جب مسلمان ہوئے۔ تو چچا نے اُن کو
رسّی سے باندھ کر مارا۔

حضرت زبیر کو اُن کے چچا چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں
دیتے تھے۔ غرض کہ قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں نے ایسے ایسے ظلم برداشت
کئے اور ایسی ایسی تکلیفیں سہیں۔ کہ اُن کے تصور سے بدن کانپ
اٹھتا ہے۔

میدانِ جنگ میں

جب کفار کے مظالم حد سے بڑھ گئے۔ اور آنحضرتؐ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ میں آ گئے۔ تو کفارِ مکہ کو پھر بھی چین نہ آیا وہ کور چشم تھے۔ جو آفتابِ اسلام کی شعاعیں دیکھ ہی نہیں سکتے تھے انہوں نے دل میں ٹھان لی۔ کہ پرستارانِ اسلام کو معدوم کر کے دم لیں گے۔ ان کو مدینہ میں نہ رہنے دیں گے یا مدینہ کو برباد کریں گے۔

آخر انہوں نے ایک ہزار مسلح فوج کے ساتھ چڑھائی کی۔ آنحضرت کو کفار کی پیش قدمی کی خبر ہوئی۔ تو انہوں نے بھی صحابہ کو مشورہ کے لئے طلب کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور صحابہؓ نے ولولہ انگیز تقریریں کیں۔ جو گرمئ محفل کے لئے نہ تھیں۔ بلکہ ان کے دلی جذبات اور مجاہدانہ عزم کی مظہر تھیں۔

اس وقت انصار کے ایک رئیس سعد بن عبادہ آنحضرتؐ کا اشارہ پا کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔

"خدا کی قسم! آپ فرمائیں۔ تو ہم سمندر میں کود پڑیں"۔

ایک اور شخص اٹھا۔ اور بولا:۔

"ہم موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا دونوں جا کر لڑیں۔ ہم نہیں لڑتے۔ ہم لوگ آپ کے دائیں بائیں۔ سامنے اور پیچھے سے ہر طرف سے لڑیں گے"۔

ایسی دلاورانہ تقریریں سن کر آنحضرتؐ بہت خوش ہوئے اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اور اپنے جاں نثاروں کی چھوٹی سی فوج لے کر مدینہ سے باہر نکل آئے۔

معرکہ بدر

مدینہ سے ایک میل دور جا کر آنحضرتؐ نے اپنے جاں نثاروں کی دیکھ بھال کی۔ چھوٹی عمر کے بچوں کو واپس کر دیا۔ اور فرمایا کہ خطرے کے موقعہ پر بچوں کا کام نہیں۔

عمیرؓ نامی نوجوان کی عمر بمشکل سولہ برس کی تھی۔ فوج میں چھپا

پھرتا تھا کہ آنحضرت اُسے بھی دیکھ کر نکال نہ دیں۔ لیکن کب تک چھُپ سکتا تھا۔ آخر اُسے سامنے آنا پڑا۔ کم عمر ہونے کی وجہ سے جب اُسے واپس جانے کا حکم ہوا۔ تو زار زار رونے لگا حضور صلعم نے اس کا جوشِ شجاعت دیکھ کر اجازت دے دی اور اس کے بھائی نے ایک تلوار اس کی کمر میں لٹکا دی۔

جب سالارِ اعظم نے ہر چھوٹے بڑے کل جوان گنے۔ تو صرف ——— ۳۱۳ ——— ہوئے جن میں ۶۰ مہاجر اور باقی ——— ۲۵۳ ——— انصار تھے

بدر کے مقام پر معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ لڑائی شروع ہوئی اور خوب زور شور سے شروع ہوئی۔ بہادرانِ اسلام نے اس شدت سے حملے کئے کہ دشمنوں میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے دشمن کے بڑے بڑے بہادروں کا صفایا کر دیا۔

ابوجہل کی ہلاکت

جب عام حملہ شروع ہو گیا تو ابوجہل کفار کو بھڑکاتا تھا۔ اِدھر مسلمان بھی اس تاک میں تھے کہ اس سب سے بڑے دشمنِ اسلام کا قصہ تمام کیا جائے۔

معوذ اور معاذ۔ اسلامی فوج کے دو نوجوان مجاہد بھائیوں نے عہد کیا کہ یا تو آج ابوجہل کا نام دنیا سے مٹا دیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔

دونوں بھائی اپنے سالار عبدالرحمٰن کے دائیں بائیں تھے انہوں نے پوچھا۔ چچا! ابوجہل کہاں ہے۔

وہ بولے۔ کیوں؟

انہوں نے جواب دیا "ہم اسے قتل کریں گے۔ یا خود جان دے دیں گے۔"

عبدالرحمٰن نے ابوجہل کو فوج میں گھوڑا کوداتے دیکھا۔ اور اشارہ سے بتایا۔ "وہ ہے"

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں بھائی اس پر باز کی طرح جھپٹے۔ اور ابوجہل کو ہلاک کر کے خاک و خون میں گرا دیا۔

معاذ کا حوصلہ۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے پیچھے سے آکر معاذ کے کندھے پر تلوار ماری۔ جس سے اس کا بازو کٹ گیا۔ چونکہ تھوڑا سا چمڑا کٹنے سے رہ گیا تھا۔ اس لئے بازو گرا نہیں، اور کندھے کے ساتھ لٹکتا رہا۔ لیکن معاذ اسی حالت میں تلوار چلاتا رہا۔ بازو لٹکنے سے درد ہوتا تھا۔ اس لئے اس نے کٹا ہوا ہاتھ پاؤں کے نیچے دبا

کر اس زور سے کھینچا کہ بازو جُدا ہوگیا۔ معاذ عکرمہ کے پیچھے پڑا اگر وہ بچ گیا۔

ایسے جانباز مجاہدوں کی بدولت جو صرف ---- ۳۱۳ ---- تھے۔ خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں کو ---- ۱۰۰۰ ---- کفار پر نمایاں فتح حاصل ہوئی۔

مجاہدانہ شہادتیں

جنگِ بدر میں سفیان بن خالد قتل کیا گیا تھا۔ کفار کے دِل میں بے پناہ انتقامی جذبہ مشتعل تھا۔ اور وہ کسی نہ کسی بہانے خون شہدا سے اس آگ کو بجھانے کے لئے بیقرار تھے۔ انہوں نے جنگِ بدر سے چار ماہ بعد ایک خوفناک منصوبہ سوچا۔ یعنی بنولحیان نے قبیلۂ عضل و قارہ کے لوگوں سے کہا۔ کہ "ہم تم کو اس قدر مواشی اور اونٹ دیں گے۔ اگر تم رسولؐ خدا کے پاس جاکر کسی بہانے سے اُن کے اصحاب کو یہاں لے آؤ۔ تاکہ ہم اس شخص کو ماریں، جنہوں نے ابوسفیان کو مارا ہے اور بقیہ کو اسیر کر کے قریش کے حوالے کردیں۔"

چنانچہ دونوں قبیلوں کے سات آدمی آنحضرت سے دس

صحابہ کو تبلیغ اسلام کے بہانہ سے لے آئے۔ جب یہ لوگ مقام رجیع پر پہنچے۔ تو انہوں نے عہد شکنی کی اور قبیلہ بنو لحیان کو اشارہ کیا۔ چنانچہ بنو لحیان کے دو سو آدمی جن میں ایک سو تیر انداز تھے مسلمانوں پر پل پڑے۔ ان اصحاب نے ایک ٹیلہ پر پناہ لی۔ تو کفار نے کہا۔ کہ

"تم نیچے آجاؤ۔ ہم تم کو پناہ دیں گے۔"

لیکن حضرت عاصم نے کفار کی پناہ میں آنے سے انکار کر دیا۔

ان دس اصحاب میں سے حضرت خبیب بن عدی۔ زید بن دثنہ اور عبداللہ بن طارق نے کفار کی اسیری قبول کرلی۔ باقی لڑائی میں مصروف ہو گئے۔

حضرت عاصم نے کہا۔ میں نے اپنے اوپر نذر واجب کرلی ہے کہ کسی مشرک کی پناہ قبول نہ کروں گا۔ انہوں نے قتل کے وقت حسب ذیل رجزیہ اشعار پڑھے۔

میں کماندار اور تیغ بکف جس سے دشمن تمام ہیں بیدل
تیر لرزاں۔ کماں سے چلتے ہیں موت حق اور زندگی باطل

نہیں مٹتا نوشتۂ تقدیر   اس کو پورا کرے گا خود انساں
ذکر وں جنگ میں اگر تم سے   ہو گی حسرت میں ماں مری گریاں
(آزاد ترجمہ)

جب حضرت عاصم نے اپنے تمام تیر چلا کر ترکش خالی کر دیا تو بھالے سے کفار کو مارنے لگے۔ یہاں تک کہ بھالا بھی ٹوٹ گیا صرف تلوار باقی رہی۔ تب عاصم نے کہا:۔

میرے پروردگار ہر ساعت   میں تیرے دین کا رہا حامی
بن میرے گوشت پوست کا حافظ   تاکہ کفار کو ہو ناکامی
(آزاد ترجمہ)

اس کے بعد حضرت عاصم نے تلوار کا میان توڑ دیا۔ اور کفار پر نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ یہاں تک کہ آپ اور دوسرے اصحاب شہید ہو گئے۔

ایک عورت سلافہ بنت سعد نے جن کا شوہر اور چار بیٹے مارے گئے تھے اور دو لڑکوں کو عاصم نے مارا تھا۔ یہ منت مانی تھی۔ کہ اگر مجھے موقع ملا۔ تو عاصم کے کاسۂ سر میں شراب پیوں گی جو اس کا سر لا دیگا۔ سو اونٹ انعام دوں گی۔ اس منت کی اہلِ عرب اور بنو لحیان کو اطلاع تھی۔ چنانچہ حضرت عاصم کی شہادت کے

بعد کفار۔ اُن کا سر کاٹنے کے ارادے سے آگے بڑھے۔ تو دیکھا کہ عاصم کی نعش پر بھڑوں کا چھتہ تعین ہے۔ جو کوئی عاصم کی طرف جاتا تھا۔ اس کے منہ پر بھڑ حملہ کر کے زخمی کر دیتے تھے۔ تب کافروں نے مشورہ کیا کہ عاصم کو ایسے ہی چھوڑ دو۔ رات ہونے پر جب بھڑ اڑ جائیں گے۔ تو اپنا کام کریں۔ لیکن شام ہوتے ہی حق تعالیٰ نے بارش کا ایسا سیلاب بھیجا۔ کہ عاصم کی نعش بہا کر لے گیا۔ عاصم کی دعا پوری ہو گئی اور کافر ہاتھ ملتے رہ گئے۔

حضرت خبیب۔ مکہ میں حضرت خبیب کو ماریہ عورت کے گھر میں قید رکھا۔ ماریہ سے جو بعد میں مسلمان ہو گئی۔ روایت ہے۔ کہ

"میں نے کسی کو خبیب سے بہترین انسان نہیں دیکھا جتنے دن قید رہے۔ اُن کے دروازے کے شگاف سے دیکھتی رہی۔ ان کو غیب سے انگور مہیا ہوتے تھے۔ وہی ان کا رزق تھا۔ راتوں کو تہجد کی نماز میں قرآن پڑھا کرتے تھے۔"

جب قتل کا دن آیا۔ تو اُن کو زنجیروں میں باندھ کر مقام تنعیم تک لے گئے۔ وہاں کفار کے مردوں۔ عورتوں اور بچوں کا ایک ہجوم تھا۔ چنانچہ میدان میں ایک لمبی لکڑی گاڑی گئی اور خبیب کو

اس کے پاس لے گئے۔ اس وقت خبیب نے کہا کہ "مجھے نماز پڑھنے کی اجازت دو۔" کفار نے منظور کر لیا۔ تو دو رکعت نماز کے بعد یہ دعا مانگی:۔

"اے اللہ! ان کے اعداد کو شمار کر اور ان کو پراگندہ کر کے ہلاک کر۔ اور ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑ۔"

معاویہ بن سفیان کہتے ہیں:۔

"میں بھی دعائے خبیب کے وقت موجود تھا تو میں نے دیکھا۔ کہ میرا باپ ابو سفیان دعائے خبیب سے خوفزدہ ہو کر مجھے زمین پر لٹاتا تھا۔ اور اس نے مجھے ایسی سختی سے گھسیٹا۔ کہ میں سرین کے بل گر پڑا۔ اور اس چوٹ کے صدمہ سے میں مدت تک دردمند رہا۔"

اسی طرح حکیم ابن حزام نے کہا۔ کہ

"دعائے خبیب کے خوف سے میں نے اپنے آپ کو پتوں کی آڑ میں چھپایا اور اسی طرح اور اشخاص بھی دعا کے خوف سے تتر بتر ہو گئے۔"

حارث بن صابر نے کہا:۔

"مجھے یقین تھا کہ دعائے خبیب کسی کو نہ چھوڑیگی"

حضرت عمرؓ نے سعید بن عامر کو حمص کا عامل مقرر کیا تھا لیکن اُن کا یہ حال تھا۔ کہ کبھی کبھی اُن پر حالتِ غشی طاری ہو جاتی تھی باوجودیکہ وہ اپنے اصحاب کے درمیان ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اس غشی کے متعلق پوچھا۔ کہ تم پر کسی جن کا اثر تو نہیں ہے"

جواب دیا:۔

"ایسا نہیں۔ بلکہ میں بھی دعائے خبیب کے وقت اس مجمع میں موجود تھا۔ اور میں نے اُن کی دُعا سُنی۔ واللہ اس وقت سے آج تک جب کبھی مجھے اُن کی دُعا کا خیال آتا ہے۔ تو میں خواہ کسی مجمع میں ہوں۔ مجھ پر یکایک غشی طاری ہو جاتی ہے"

نوفل بن معاویہ سے مروی ہے۔ کہ

"میں اس روز خبیب کی دُعا کے وقت موجود تھا میں نے ان لوگوں سے سُنا۔ جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ کوئی بھی دُعا کے اثر سے محفوظ نہیں رہا۔ اور میں اُن کی دُعا کے خوف سے زمین پر جھک گیا۔ اور قریش ایک

ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ ایسی حالت میں رہے۔ کہ اُن کی مجالس میں دعائے خبیب کے سوا کسی بات کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا۔"

غرض کفار حضرت خبیب کو لے گئے۔ اور ان کو جکڑ کر باندھ دیا۔ اور کہنے لگے:۔

"اگر تو اسلام سے پھر جائے۔ تو ہم تجھ کو چھوڑ دیں گے۔"

انہوں نے جواب دیا:۔

"میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ چاہے تمام دنیا کی دولت مجھے دی جائے۔"

پھر کفار نے کہا:۔

"تو اتنا ہی کہہ دے۔ کہ میری جگہ (حضرت) محمد صلعم) ہوں اور میں اپنے گھر میں بیٹھوں۔"

خبیب نے کہا:۔

"واللہ! میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آنحضرت ؐ کے تلوے میں ایک کانٹا چبھے اور میں آرام سے بیٹھوں خواہ زمین و آسمان مجھے چکی بن کر پیس ڈالیں۔"

اس کے بعد قریشِ مکہ نے ایسے چالیس لڑکوں کو جن کے باپ یا قریبی رشتہ دار جنگِ بدر میں مارے گئے تھے۔ ایک ایک نیزہ دے کر کہا۔

"یہ شخص وہ ہے جس نے تمہارے آباء اور اعزہ کو مارا ہے"

تب ان لڑکوں نے خبیب پر حملہ کر کے ان کا تمام بدن چھلنی کر دیا۔ اور خبیب اس وقت قبلہ رو ہو کر کلمۂ شہادت پڑھ رہے تھے۔

زید بن دثنہ ۔ ایسے ہی زنجیروں میں جکڑ کر زید بن دثنہ کو لائے۔ جب دونوں صحابی ایک جگہ ہوئے تو ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔ اسی طرح زید کو سولی سے باندھا گیا اور وہی سوال کئے۔ جو حضرت خبیب سے کئے تھے اور وہی جواب پائے جو حضرت خبیب نے دیئے تھے چنانچہ ایسی ہی تکالیف دے کر ان کو بھی شہید کیا گیا۔

حضرت زید نے قتل کے وقت سولی کے نیچے کھڑے ہو کر یہ فی البدیہہ اشعار پڑھے۔

"میرے چاروں طرف کافر کھڑے ہیں قبائل سب بلائے ہیں انہوں نے
جفا و جور اور قہر و غضب کے عجب منظر دکھائے ہیں انہوں نے

قبائل ہو گئے ہیں جمع سارے	ہیں اُن کی عورتیں بچے بھی موجود
ڈراتے ہیں مجھے سولی کے ڈر سے	یہ کرنا چاہتے ہیں مجھ کو نابود

میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں	مگر دل کو نہیں ہے بیقراری
نہیں آہ و بکا ہرگز کروں گا	کہ جاتا ہوں حضورِ ربِ باری

میں اپنی حالتِ زار و زبوں پر	فقط اللہ سے کرتا ہوں فریاد
مرا سب کچھ خدا کے واسطے ہے	کروں گا جاں فدا با خاطرِ شاد

(آزاد ترجمہ)

حضرت امیر حمزہ

اسلام کے نامور بہادر حضرت امیر حمزہ رسولِ پاک کے چچا تھے۔ جب آنحضرت نے تبلیغِ اسلام شروع کی۔ اس وقت انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔

ایک دن آنحضرت خانہ کعبہ میں اسلام کی تبلیغ فرما رہے تھے۔ کہ ابوجہل نے آپؐ کی شان میں گستاخی کی۔ اور آپ سب کچھ سُن کر چپ چاپ کعبہ سے باہر نکل آئے۔

امیر حمزہ شکار کو گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو انہوں نے ابوجہل کی بدزبانی کا واقعہ سُنا۔ خانہ کعبہ میں گئے۔ ابوجہل کی خوب گت بنائی اور اُسے زخمی کر دیا۔

کافر حیران تھے۔ کہ امیر حمزہؓ بھی مسلمانوں میں جا ملے۔

آپ وہاں سے فوراً آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ اور ہر طرح اُن کا ساتھ دیا۔

جنگِ بدر میں جب دونوں طرف کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو سب سے پہلے تین بہادر مسلمانوں کی طرف سے میدان میں آئے اُن میں حضرت حمزہ بھی تھے۔ انہوں نے پہلے ہی وار میں اپنے مدِمقابل عتبہ کو جہنم واصل کیا۔ پھر حضرت علی کے ساتھ مل کر ولید کا بھی خاتمہ کیا۔

کفار نے طیش میں آکر عام حملہ بول دیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ حضرت حمزہ میدانِ جنگ میں نمایاں تھے۔ اُن کے دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ اور پرے کے پرے صاف کرتے جاتے تھے جنگِ بدر کے کافر قیدیوں کا بیان تھا۔ کہ اگر اس جنگ میں امیر حمزہ شامل نہ ہوتے۔ تو ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ اُن کے زورِ شجاعت سے دشمنوں کو شکستِ فاش ہوئی۔

امیر حمزہ جب دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے میں مصروف تھے تو ایک پہاڑی کے پاس سے گذرے۔ وہاں ایک حبشی گھات لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اچانک پیچھے سے حملہ کیا۔ اور آپ کا جسم دو ٹکڑے ہو گیا۔

آپ کی وفات پر کفار کی عورتوں نے خوشی و مسرت کے گیت گائے۔ ابوسفیان کی بیوی ہند نے آپ کی ناک اور کان کاٹ کر ان کا زیور پہنا۔ اور جگر نکال کر چبایا۔ مگر نگل نہ سکی۔ سرور کائناتؐ کو امیر حمزہؓ کی شہادت پر بہت رنج ہوا۔ آپؐ نے مدینہ میں فرمایا۔ کہ اگر حمزہ کی مستورات ہوتیں۔ تو وہ گریہ زاری کرتیں۔ چنانچہ اہل مدینہ نے اس دن سے یہ دستور بنالیا کہ جب کبھی کسی کا عزیز انتقال کر جاتا۔ تو خواتین پہلے حضرت حمزہؓ کا نوحہ کرتیں اور پھر اپنے عزیز کا ماتم کرتی تھیں۔

ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر

ایک بہادر عورت

کافروں نے یہ کیسا جنگ اُحد میں مشہور
کہ پیغمبر بھی ہوئے کشتۂ شمشیرِ دو دم

ہو کے مشہور مدینہ میں جو پہنچی یہ خبر
ہر گلی کوچہ تھا ماتم کدۂ حسرت و غم

ہو کے بیتاب گھروں سے نکل آئے باہر
کودک و پیر و جواں و خدم و خیل و حشم

وہ بھی نکلیں کہ جو تھیں پردہ نشینانِ عفاف
جن میں تھیں سیدۂ پاک بھی با دیدۂ نم

ایک خاتون کہ انصار تھیں نام سے تھیں
سخت مضطر تھیں نہ تھے ہوش و حواس انکے بہم

موقع جنگ پہ پہنچیں تو یہ لوگوں نے کہا
کیا کہیں تجھ سے کہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں ہم
تیرے بھائی نے لڑائی میں شہادت پائی
تیرے والد بھی ہوئے کشتۂ شمشیرِ ستم
سب سے بڑھ کر یہ کہ شوہر بھی ہوا تیرا شہید
گھر کا گھر صاف ہوا، ٹوٹ پڑا کوہِ الم

اس عفیفہ نے یہ سن کے کہا تو یہ کہا
یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہِ اُمم!
سب نے دی اس کو بشارت کہ سلامت ہیں حضور
گرچہ زخمی ہیں سر و سینہ و پہلو و شکم
بڑھ کے اس نے رُخِ اقدس کو جو دیکھا تو کہا
تو سلامت ہے تو پھر ہیچ ہیں سب رنج و الم
مَیں بھی، اور باپ بھی، شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہِ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

(شبلی نعمانی)

خلفائے راشدین کی شہادت

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوئے۔ اور اس خوبی، قابلیت اور جوانمردی سے مذہبی و ملکی کام سرانجام دیئے۔ کہ تمام اطراف ملک میں ان کی عظمت و جبروت کی دھاک بیٹھ گئی۔ ان کی خلافت کا زمانہ اگرچہ بہت مختصر تھا۔ مگر انہوں نے دینِ اسلام اور اسلامی حکومت کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔

حضرت عمرِ فاروقؓ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ خلافت کے منصب پر مامور ہوئے۔ ان کی خلافت کا زمانہ ملکی نظم و نسق

استحکامِ سلطنت، رعایا پروری کے لحاظ سے نہایت شاندار تھا۔ جو فتوحات ان کے عہد میں ہوئیں۔ جس قدر اصلاحات انہوں نے کیں۔ وہ دوستوں کی مسرت اور دشمنوں کے لئے اضطراب کا موجب تھیں۔

حضرت عمرؓ عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اور ہر ایک سے یکساں برتاؤ کرتے تھے۔

ایک دن مغیرہ بن شعبہ کے پارسی غلام فیروز نے حضرت عمرؓ سے اپنے آقا کے بھاری محصول مقرر کرنے کی شکایت کی شکایت لے جا تھی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے پروانہ کی۔ اس پر وہ اتنا ناراض ہوا۔ کہ صبح کی نماز میں خنجر لے کر اچانک حملہ کر دیا اور متواتر چھ وار کئے۔ حضرت عمرؓ زخم کے صدمے سے گر پڑے ۔ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے نماز پڑھائی

یہ حملہ نہایت سفاکانہ تھا جس پر تمام لوگوں میں تہلکہ مچ گیا۔ اور قاتل گرفتار کیا گیا۔

"خلافت کے چند نام پیش کرنے کے بعد حضرت عائشہؓ سے رسول اللہؐ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت لی۔"

پھر مہاجرین انصار، عرب اور اہل ذمہ کے حقوق کی طرف

توجہ دلائی اور اپنے صاحبزادے عبداللہ کو چند وصیتیں کیں۔

افسوس! اسلام کے وہ بطلِ عظیم ہر قسم کی ضروری وصیتوں کے بعد تین دن بیمار رہ کر محرم کی پہلی تاریخ شنبہ کے دن ۲۳ھ کو واصل بحق ہوئے اور محبوب رہنما سردارِ عالمؐ کے پہلو میں ہمیشہ کے لئے آسودۂ خواب ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ

خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ بڑے مدبر، منتظم اور سیاستدان تھے۔ حضرت عمرؓ کے بعد انہوں نے اپنے فرائض نہایت قابلیت کے ساتھ انجام دیئے۔

اُن کی خلافت کا زمانہ کل دس سال تھا جس میں شروع کے چھ سال تو امن چین سے گذرے اور اسلامی حکومت میں بہت ترقی ہوئی۔ دینی اور دنیوی لحاظ سے مسلمانوں نے کافی اقتدار حاصل کیا لیکن ان چھ سال کے بعد لوگوں میں دولت مندی اور عیش و مسرت کی وجہ سے جھگڑے شروع ہو گئے۔ بعض لوگوں کو خاص حضرت عثمانؓ سے شکایتیں پیدا ہو گئیں۔ جو محض غلط اور کسی کینہ کی وجہ سے تھیں۔ مگر عوام کو اصل حقیقت معلوم نہ تھی کہ اس کے

پردے میں کیا بات کام کر رہی ہے۔ اس لئے لوگوں میں بہت جوش پھیل گیا۔ یہاں تک کہ بصرہ، مصر اور کوفہ کے کچھ مفسدوں نے ایک دم مدینہ پر حملہ کر دیا اور شہر کے گرد ڈیرے ڈال دیئے بڑے بڑے صحابہ کو مصالحت کے لئے کہا گیا۔ مگر وہ سب الگ رہے۔

سمجھانے بجھانے سے حملہ آور واپس چلے گئے۔ مگر آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی اور ایسی غلط فہمیاں پھیلائی گئیں جن سے حضرت عثمان کا تعلق نہ تھا۔ ان مفسدہ پرداز لوگوں کا ہجوم شہر میں گھس گیا اور حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔

حضرت عثمان نے کوٹھے پہ چڑھ کر ان کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اپنے ناپاک عزم پر تلے ہوئے تھے کہ حضرت عثمان کو شہید کر کے ہی دم لیں گے۔

جب فسادیوں نے ان کی کوئی بات نہ سنی۔ اور وہ بدم مشتعل ہونے لگے۔ تو دوست احباب مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ اور باغیوں کی سرکوبی کا مشورہ دیا۔ تو آپ نے فرمایا۔

"میرا سب سے زیادہ خیر خواہ وہ شخص ہو گا۔ جو اپنا ہاتھ روکے رکھے گا۔ اور ہتھیار نہ اٹھائے گا۔ میں تمہیں

قسم دیتا ہوں۔ کہ تلواریں پھینک دو۔ اگر میں لڑنا
چاہتا، تو فوجوں کو بلا سکتا تھا۔ میں ہرگز وہ پہلا
شخص نہیں بننا چاہتا۔ جو مسلمانوں کو آپس میں لڑائے اور
بھائی کو بھائی کے قتل کرنے پر آمادہ کرے۔ میں اپنی جان دینے
کے لئے تیار ہوں۔ مگر مسلمانوں کا خون بہتا دیکھنا
گوارا نہیں کرتا۔"

یہ وقت نہایت پریشان کرنے والا تھا۔ دشمن جان لینے کے
درپے ہیں۔ موت سامنے کھڑی ہے اور نہایت اطمینان کے ساتھ
قرآن شریف پڑھ رہے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے
مسلمان پیغمبر خدا کے جانشیں، خداوند کریم کے برگزیدہ بندے، نہ
خوف تھا۔ نہ ہراس نہایت اشتیاق کے ساتھ جام شہادت
نوش کرنے کے منتظر تھے۔ کہ بہت جلد اپنے انتظار کرنے والے
آقا کے پاس جنت الفردوس میں جا کر آرام کریں۔

حضرت امام حسنؓ رسول خدا کے نواسے اور حضرت علیؓ کے
صاحبزادے دروازہ پر پہرہ دے رہے تھے۔ لیکن باغی دیوار
پھاند کر گھر میں گھس آئے۔ اور ان میں سے کنانہ بن بشر نامی ایک
ملعون نے عین اس وقت جب آپ اس آیت کی تلاوت کر رہے

تھے۔ کہ "فسیکفیکھم اللہ" پہلا وار کیا جس سے آپ زمین پر گر پڑے۔ اور زبان سے یہ صدا نکلی۔ "بسم اللہ توکلت علی اللہ" پھر دوسرے کمبختوں نے جلدی جلدی وار کئے۔ بدن زخمی ہو گیا۔ اور بار بار فرماتے۔ "خدایا محمد کی امت کو اتفاق دے"

آخر بتاریخ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو ایک عظیم الشان سلطنت کا خلیفہ نہایت دلیری کے ساتھ جام شہادت نوش کر کے اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔

حضرت علیؓ

حضرت علیؓ خلیفہ چہارم نہایت بہادر، زیرک اور مدبر تھے لیکن تخت خلافت پر بیٹھتے ہی ان کی مخالفت شروع ہو گئی اور بہت سے لوگوں کو یہ خیال تھا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کی سازش میں حضرت علیؓ بھی شریک تھے۔ چنانچہ ان میں حضرت عائشہؓ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی تھے

حضرت عثمانؓ۔ امیر معاویہ بن امیہ کے خاندان سے تھے اور حضرت علیؓ بنی ہاشم میں سے۔ ان دونوں خاندانوں کی قدیم زمانہ سے دشمنی چلی آتی تھی۔ یہ رفتہ رفتہ زیادہ بڑھتی گئی۔ اور بہت

سے لوگ حضرت علیؓ کے دشمن ہو گئے۔ آخر ایک فرقہ خوارج کا پیدا ہو گیا۔ جس نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ مصر میں ابو العاص کو، دمشق میں معاویہ کو اور کوفہ میں حضرت علیؓ کو قتل کیا جائے۔ اس کام کے لئے تین آدمی مقرر کئے گئے اور قرار پایا کہ تینوں جمعہ کے دن نماز صبح کے وقت ایک ہی وقت میں تینوں کا خاتمہ کریں۔ وہ دونوں تو بچ گئے۔ مگر جب حضرت علیؓ صبح کی نماز کے لئے نکلے۔ تو مقررہ قاتل ابن ملجم نے دو اور آدمی اپنے ساتھ ملا لئے اور تینوں ایک ہی مرتبہ ٹوٹ پڑے۔ جس سے حضرت علیؓ سخت مجروح ہوئے۔ ابن ملجم اسی وقت مارا گیا۔ دوسرا گرفتار ہوا۔ اور تیسرا بھاگ گیا۔

حضرت علیؓ نے آخری وقت فرمایا:۔

"دیکھو! میں کل تمہارا خلیفہ تھا۔ اور آج تمہارے لئے عبرت ہو جاؤں گا۔ تم میرے بعد کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہرانا۔ اور رسول صلعم کی سنت کو ضائع نہ کرنا۔"

"اے اولاد عبد المطلب! میرے قاتل کے سوا کوئی دوسرا قتل نہ ہونا چاہئے۔ دیکھو! اگر میں اس کے وار سے مر جاؤں۔ تو اسے ایک ہی ضرب سے قتل کرنا۔ زیادہ اذیت نہ دینا۔"

آپ ۲۷ ماہِ رمضان سنہ ۴ھ میں اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔ شہادت کے وقت آپ کی عمر ساٹھ سال تھی۔

خلافتِ فاروقی کا ایک واقعہ

معمول تھا جناب عمرؓ کا کہ متصل
کرتے تھے گشت رات کو سونا محال تھا
اِک دن کا واقعہ ہے کہ پہنچے جو دشت میں
کوسوں تلک زمین پہ خیموں کا جال تھا
بچے کئی تھے ایک ضعیفہ کی گود میں
جن میں کوئی بڑا تھا کوئی خرد سال تھا
دیکھا جو اُس کو یہ کہ پکاتی ہے کوئی چیز
جاتا رہا جو طبع خزائن میں ملال تھا
سمجھے کہ اب وہ ملک کی حالت نہیں رہی
کم ہو چلا ہے قحط کا جو اشتعال تھا
پوچھا خود اُس سے جا کے تو رونے لگی کہ آہ
کیا آپ کو غذا کا بھی یاں احتمال تھا

بچے یہ تین دن سے تڑپتے ہیں خاک پر
میں کیا کہوں زبان سے اِن کا جو حال تھا

مجبور ہو کے اِن کے بہلنے کے واسطے
پانی چڑھا دیا ہے یہ اُس کا اُبال تھا

اِن سے یہ کہہ دیا ہے کہ اب مطمئن رہو
کھانا یہ پک رہا ہے اسی کا خیال تھا

بے اختیار رونے لگے حضرتِ عمرؓ
بولے کہ یہ مرے ہی کئے کا وبال تھا

جو کچھ کہ ہے یہ سب ہے میری شامتِ عمل
از بس گناہ گار میرا بال بال تھا

بازار جا کے لائے سب اسباب و آبِ نان
جو زخمِ قحط کا سببِ اندمال تھا

چولہے کے پاس بیٹھ کے خود پھونکتے تھے آگ
چہرہ تمام آگ کی گرمی سے لال تھا

بچوں نے پیٹ بھر کے جو کھایا تو کھل اُٹھے
ایک ایک اب تو فرطِ خوشی سے نہال تھا

تھی وہ زنِ ضعیف سراپا زبانِ شکر

یاں حضرت عمرؓ کو وہی انفعال تھا

عہدہ عمرؓ کو یہ جو ملا تجھ سے چھن کر
جو کچھ گذر رہا ہے یہ اُس کا وبال تھا

(شبلی نعمانی)

جنگِ یرموک

قیصر روم نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر دو لاکھ چالیس ہزار کی فوج عظیم لے کر اسلامی علاقے کی طرف بڑھا مسلمان صرف چالیس ہزار مردانِ کار کا جیش لے کر میدان میں نکلے۔

یرموک[1] کے میدان میں گھمسان کا رن پڑا۔ رومی سپاہ نے نہایت شدت سے عرب فوج کے بائیں بازو پر حملہ کیا۔ حضرت سلمہ جو بائیں بازو کے سالار تھے۔ دادِ شجاعت دیتے ہوئے سخت زخمی ہوئے۔ اور گھوڑے سے گر پڑے۔ لوگوں نے سالار سلمہ کا گھوڑا بغیر سوار کے اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھا۔ تو بہت پریشان ہوئے۔ حذیفہ سلمہ کے ایک رفیق اپنے سردار کی تلاش

---

[1] جنگِ یرموک حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت ۱۵ھ میں واقع ہوئی۔

میں مصروف ہوگئے اور جلد ہی انہوں نے دیکھا۔ کہ سلمہ زخموں کی کثرت اور بڑی مقدار میں خون بہ جانے کی وجہ سے زمین پر انتہائی کمزوری کے عالم میں گر پڑے ہیں۔

سلمہ مشکل ہی سے لب کھول سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے رفیق سے پہلا سوال یہی کیا۔ کہ "جنگ کا نقشہ کیا ہے" ؟ حذیفہ کا جواب تھا

"اسلامی فوج نے کامیابی کے ساتھ اپنے دائیں بازو کی حفاظت کی ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے، کہ اب وہ مدافعت کی بجائے حملہ کر رہے ہیں، اور رومیوں میں بد دلی اور گھبراہٹ کے آثار نمودار ہو چلے ہیں۔

عالم نزع میں سسکتے ہوئے۔ اسلام کے جانباز سلمہ کا زرد چہرہ یہ الفاظ سن کر دمک اٹھا۔ انہوں نے انتہائی جد وجہد کے بعد اپنا سر اٹھایا اور نعرہ لگایا

"دوستو! رفیقو! آگے بڑھو! آگے بڑھو! فتح تمہاری منتظر ہے میں فتح اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہوں، قبل اس کے کہ۔ ۔ ۔ ۔"

الفاظ پورے نہ ہو سکے، اور وہ تھک کر گر پڑے۔ دیکھی

آوازیں، حذیفہ نے الفاظ سنے۔

"حذیفہ! بھائی حذیفہ پانی کا ایک قطرہ دو"

حیرت انگیز ایثار

حذیفہ دوڑ دھوپ اور سخت دشواری کے بعد پانی کا ایک پیالہ لے آئے سلمہ نے پیالہ ہاتھ میں لیا۔ لیکن برابر ہی ایک اور مسلمان سپاہی زخموں کی شدت سے کراہ رہا تھا "پانی، پانی۔ صرف ایک قطرہ پانی!" سلمہ کے کان میں یہ آواز پڑی، اور پانی کا وہ پیالہ جو ان کے لبوں تک پہنچ چکا تھا۔ رہ گیا۔ اور برابر والے زخمی سپاہی کے لئے حذیفہ کے ہاتھ میں چلا گیا "یہ پیالہ اسے دے دو"

حذیفہ پیالہ لے کر ہشام زخمی سپاہی کے پاس پہنچے۔ ہشام نے انتہائی مسرت کے ساتھ پیالہ لے لیا اور ابھی وہ پینے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ دور سے ایک اور آواز سنائی دی۔

"—— پانی، پانی۔!"

ہشام نے پیالہ واپس حذیفہ کو دے دیا، اور آواز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ پیالہ اس زخمی کو دے دو۔ وہ مجھ سے زیادہ پیاسا معلوم ہوتا ہے۔"

حذیفہ تیسرے آدمی کے پاس پہنچے۔ لیکن پانی "کی آواز کے ساتھ ہی اس نے پیالہ واپس کر کے اس نے کسی دوسرے پیاسے زخمی کی طرف اشارہ کیا۔ مسلسل یہ عمل جاری رہا۔ چنانچہ جب ساتویں آدمی کے پاس پہنچے تو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی وہ شہید ہو چکا تھا۔ واپسی میں دوسرا پیاسا بھی پیاس کی آخری قربانی کے بعد شہید ہو چکا تھا۔ جب وہ ہشام کے پاس آئے۔ تو وہ بھی اپنے ایثار کے بعد زندہ نہ رہ سکا تھا۔ حذیفہ نہایت اندوہ اور کرب کی حالت میں پھر سلمہ کے پاس پہنچے۔ لیکن وہاں پہنچنے پر بھی یہی معلوم ہوا کہ سلمہ شہید ہو چکے ہیں۔

" اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر و للہ الحمد" پڑھتے ہوئے حذیفہ واپس آ کر جنگ میں شریک ہو گئے اور بدستور داد شجاعت دینے لگے

عکرمہ کی شہادت

جنگ یرموک میں رومیوں کی ٹڈی دل فوج اور اس کے پے در پے حملے عرب فوج کے لئے انتہائی صبر آزما مرحلہ تھا۔ عرب فوج میں ایک مرحلہ پر تھوڑی سی لرزش پیدا ہو چلی تھی۔ رومی جنگجو

مسلسل حملوں میں شدت پیدا کرتے جا رہے تھے مسلمان افسروں میں اِس روز عکرمہؓ سے زیادہ شجاعت و دلیری میں کوئی سبقت نہ لے جا سکا۔

عکرمہ ابوجہل کے ایک بیٹے تھے، جو اسلام کا جانی دشمن تھا عکرمہ جنہوں نے پیغمبرِ اسلام صلعم کی فوج کے خلاف غزوۂ بدر میں جنگ کی تھی۔ ان کا باپ مارا گیا تھا۔ جنہوں نے غزوۂ اُحد میں لشکرِ اسلام کے خلاف حصّہ لیا تھا جنہوں نے غزوۂ خندق میں ایک بہادرانہ شب خون اسلامی فوج کے خلاف مارا تھا۔ اور جو فتحِ مکہ کی مزاحمت کرنے والے صرف چند آدمیوں میں سے تھے۔

لیکن آخرکار انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

لشکرِ اسلام میں آثارِ بددلی نے عکرمہؓ میں شجاعت کا زبردست جذبہ پیدا کیا۔ عین جنگ کے موقع پر انہوں نے اپنی ماتحتی میں لڑنے والے سپاہیوں کو اکٹھا کیا۔ خود جامِ شہادت نوش کرنے کی قسم کھائی اور ساتھیوں سے پوچھا کہ "جو لوگ شہادت کا عہد کر سکتے ہوں، وہ اپنا نام بتائیں ——— "

سب نے بیک آواز حلف لیا۔ اور بے تحاشا رومی صفوں میں گھس پڑے۔ یکے بعد دیگرے اُن میں سے اکثر کے ٹکڑے ٹکڑے

کر ڈالے گئے۔ عکرمہؓ خود شدید زخمی ہوئے اور اپنے مرکب کی پشت سے گر پڑے۔ خالدؓ یہ دیکھ کر آگے بڑھے اور عکرمہ کو پانی پلایا۔ لیکن عکرمہ کی طاقت جواب دے گئی تھی۔ آخری سانس میں وہ بمشکل یہ الفاظ ادا کر سکے:۔

"خلیفہ عمرؓ کو میرے شوقِ شہادت میں شبہ تھا مجھے انتہائی مسرت ہے۔ کہ میں نے وفورِ عقیدت کے ثبوت میں شہادت کا درجہ حاصل کر لیا۔"

حضرت خالدؓ

جنگِ اُحد کے وقت تک حضرت خالدؓ نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اور اس میں انہیں کے بہادرانہ حملے کے باعث مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی۔ ۷ھ میں ان کے بھائی ولید نے جو پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔ انہیں ایک محبت بھرا خط لکھ کر دعوتِ اسلام دی۔ جس پر وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر غلامانِ رسول میں شامل ہو گئے۔

اس کے بعد حضرت خالدؓ کفار کے خلاف لڑائیوں میں شریک ہو کر بہادری کے جوہر دکھانے لگے۔ جب وہ جنگ موتہ میں دشمنانِ اسلام سے لڑ رہے تھے تو آنحضرتؐ نے مسجدِ نبویؐ میں بیٹھے بیٹھے حاضرین کو جنگ کی ساری کارروائی سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا

کہ لشکرِ اسلام کے تینوں سردار شہید ہو چکے تھے۔ اب سپہ سالاری اللہ کی ایک تلوار نے ہاتھ میں لے لی ہے۔" پھر مسلمانوں کو اسی اللہ کی تلوار کے ہاتھ پر فتح کی خوش خبری سنائی۔ یہ اشارہ حضرت خالد کی طرف تھا۔ جنہیں دربارِ رسالت ؐ سے "سیف اللہ" کا خطاب عطا کیا گیا۔

یوں تو حضرت خالدؓ کی ساری زندگی جہاد کے ذریعے سے کافروں پر فتح پاکر دُور دُور تک اسلام پھیلانے میں صرف ہوئی لیکن یہاں صرف جنگ یرموک کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ دیرِ غوطہ کو فتح کرنے کے بعد حضرت خالدؓ نے ارادہ کیا۔ کہ آگے بڑھ کر دمشق پر قبضہ کر لیں۔ لیکن وہ ابھی تجویزیں ہی سوچ رہے تھے۔ کہ خبر پہ خبر آنے لگی۔ یرموک میں رومی اپنا ٹڈی دَل لشکر جمع کر رہے ہیں۔ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ اس جنگ میں یا تو خود مٹ جائیں گے یا دشمن کو مٹا کر رکھ دیں گے۔

چنانچہ ہرقل شہنشاہِ روم نے مشہور ارمنی سپہ سالار باہان کی کمان میں دو لاکھ چالیس ہزار کی جرار فوج پورے ساز و سامان کے ساتھ یرموک میں جمع کر لی۔ اُدھر لشکرِ اسلام میں صرف چالیس ہزار مجاہدین مسلمان تھے۔ پہلے باہان نے صلح

کی گفتگو کرنے کے لئے حضرت خالدؓ کے پاس اپنا سفیر بھیج کر اُن سے قیام گاہ میں تشریف لانے کی درخواست کی۔ حضرت خالدؓ نے اسے منظور کر لیا۔ اور حضرت میسرہؓ کے ہمراہ باہان کے خیمے میں تشریف لے گئے۔

باہان نے دونوں بہادرانِ اسلام کو اپنے برابر بٹھا کر کہا "ہمارے ساتھ جنگ کرنے سے آپ کا اصل مدعا کیا ہے۔ آپ کو واضح رہنا چاہئیے۔ کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمارے شہنشاہ قیصرِ روم کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خیریت ہو۔ تو خاموشی سے واپس چلے جائیے۔

اس کے جواب میں حضرت خالدؓ نے حمد و درود کے بعد فرمایا ہم بلاوجہ کسی سے جنگ نہیں کرتے۔ بلکہ اس لڑائی کے ذمہ دار آپ ہیں۔ چونکہ آپ لوگوں نے اسلام کو مٹا دینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اس لئے ہم نے اپنی اور اسلام کی حفاظت یعنی خدائے واحد کا نام بلند کرنے کے لئے مخالفوں سے جنگ کرنے کی ٹھانی ہے تمام بادشاہوں کی متفقہ ہولناک طاقت بھی جس پر فخر کیا جاتا ہے۔ میری اس تلوار کے سامنے بالکل ہیچ اور بے حقیقت ہے میں تم کو خبردار کرتا ہوں۔ کہ یا تو آپ اسلام قبول کریں۔ یا

فرمانبردار ہو کر جزیہ دیں - اگر ان دونوں باتوں سے انکار ہے - تو اس کا فیصلہ تلوار اور صرف تلوار کرے گی۔"

باہمی گفتگو سے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا - اور دونوں فوجوں نے جنگ کی تیاری شروع کر دی - آخر "یرموک" کے مقام پر وہ گھمسان کا رن پڑا - کہ خون کی ندیاں بہ گئیں - ایک لاکھ سے زیادہ عیسائی مارے گئے - اور چالیس ہزار قید ہوئے مسلمانوں میں سے تین چار ہزار جوان شہید ہوئے۔

حضرت خالدؓ کی تمام عمر اسلام کے لئے جانبازانہ لڑائیاں لڑتے گذری۔ ۲۱ھ میں بمقام حمص حضرت خالدؓ نے وفات پائی - آپ غضب کے بہادر - سچ بولنے والے - وعدے کے پکے - اسلام کے سچے اور پُر جوش خادم اور ہمدردی، استقلال، پختہ ارادہ خدا ترسی کے نمونہ تھے۔

انہی بہادران اسلام کی جانبازانہ جدوجہد کی بدولت اسلام نے ریگزار سے نکل کر قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کا تختہ الٹ دیا اور یورپ - افریقہ و ایشیا میں اسلامی پرچم لہرا دیئے۔

شہیدِ کربلا

حضرت امام حسینؓ حضرت علیؓ کے فرزند، حضرت فاطمہؓ کے جگر بند، حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور حضرت امام حسنؓ ان کے بڑے بھائی تھے۔

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد لوگوں کے کہنے سننے سے حضرت امام حسین چھ ماہ خلیفہ رہے۔ مگر حالات دیکھ کر انہوں نے زیادہ دیر اس بار کو اٹھائے رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ مخالف لوگ ہر معاملہ میں روڑے اٹکاتے چلے آتے تھے۔

شام کا حاکم امیر معاویہ فوت ہوگیا۔ تو اس کی جگہ اس کا بیٹا یزید تخت پر بیٹھا وہ نہایت نالائق، عیاش اور مغرور آدمی تھا۔ اس وقت امام حسینؓ مدینہ میں تھے۔ وہاں سے وہ سیدھے مکے

پہنچے۔ کچھ دنوں کے بعد کوفہ سے پیغام آنے لگے۔ کہ اگر آپ یہاں آجائیں۔ تو ہم سب آپ کو خلیفہ ماننے کے لئے تیار ہیں۔ پہلے تو انہوں نے توجہ نہ کی۔ لیکن جب خطیوں کے ذریعے تقاضے ہوئے۔ تو اپنے چچیرے بھائی حضرت مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجدیا۔ کوفہ والے شروع شروع میں تو ان کے ساتھ تھے۔ لیکن جب یزید کی طرف سے ایک افسر فوج لے کر کوفے پہنچا۔ تو وہ مسلم سے الگ ہو گئے۔ اور یزید کے آدمیوں نے حضرت مسلم کو شہید کر ڈالا۔ حضرت امام حسین کو اس واقعہ کی خبر نہ تھی۔ وہ گھر سے نکل کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے راستہ میں انہیں مسلم کی شہادت کی خبر ملی یہ بھی معلوم ہوا کہ یزید نے ان کے روکنے کے لئے فوج بھیجی ہے۔

یہ خبر سن کر بعض لوگوں نے حضرت امام حسین کو مشورہ دیا کہ حالات اچھے نہیں واپس چلے جانا چاہیئے۔ مگر وہ نہ مانے۔ برابر بڑھتے چلے گئے۔ یہ دیکھ کر ساتھی لوگ خوف زدہ ہو گئے۔ اور چپکے چپکے کھسکنے لگے۔

صرف حضرت امام حسین کے کنبے کے لوگ اور خاص جاں نثار رہ گئے۔ جن کی کل تعداد بہتر تھی۔ تن بہ تقدیر سفر کرتے رہے راستہ کٹھن تھا، جنگل اور بیابان ہر طرف سنسان، شدت کی گرمی

دھوپ کی تیزی، آفتاب سر پر، آسمان سے آگ برس رہی تھی پانی کہیں نظر نہ آتا تھا۔ سب بے سروسامان، بھوک سے بیتاب دعوت دینے والوں کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ کہ آگے استقبال کرتے۔ وہ کیا آتے جو پہلے ہی پھر گئے تھے۔

کوفہ ابھی دور تھا۔ کہ یزید کے ایک سردار نے راستہ روک لیا۔ امام حسین شمال کی طرف ہٹے اور کربلا کے میدان میں جو دریائے دجلہ کے کنارے پر تھا۔ ڈیرے ڈال دیئے۔

یزید کی فوج کے سردار نے کہا۔ "یا تو یزید کو خلیفہ مانئے، ورنہ پانی بند کر دیا جائے گا۔"

حضرت امام حسین نے جواب دیا۔ "میں تو بلایا ہوا آیا ہوں۔ اور مجھے بلانے والے مسلمان ہیں۔ جو یزید کے ظلم سے تنگ آئے ہیں۔" سردار نے دریا پر پہرے بٹھا دیئے۔ امام حسین اور ان کے جاں نثاروں کے خیموں کو گھیر لیا۔

اُدھر فوجوں کے دَل تھے۔ اِدھر کل بہتر جاں نثار۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ حضرت امام حسینؑ کے بھتیجے، بھانجے، بھائی، رفیق، ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اُدھر میدان میں خون بہہ رہا تھا۔ اِدھر عورتیں بچے پیاس کی شدت سے تڑپ

رہے تھے۔ حضرت امام حسین کی گود میں معصوم اصغر پانی کے لئے بلک رہا تھا۔ آپ اسے گود میں لے کر آگے بڑھے اور کہا۔ ہمیں نہیں تو اس معصوم کے لئے تھوڑا سا پانی لینے دو۔

یہ سن کسی ظالم نے ایسا تیر مارا، کہ اس کے حلق میں آبیٹھا پانی کے بدلے خون کے چند قطروں نے معصوم کا حلق تر کیا، اور جان بحق ہو گیا۔

جب سب جان نثار شہید ہو گئے۔ تو حضرت امام حسین میدان میں نکلے۔ اور اس طرح لاش پر لاش گراتے بڑھے کہ دیکھنے والوں کے سامنے حضرت علی کی جنگ کا نقشہ پھر گیا۔ اور ان کی تلوار کی روانی یاد آگئی۔ آخر انہوں نے بھی جام شہادت نوش کیا۔

حضرت امام حسین چاہتے، تو اپنی جان اور کنبے کی آبرو بچا سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایک فاجر و فاسق کی بیعت سے حق و صداقت کے لئے جان دینا زیادہ بہتر سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تیرہ سو سال سے ہر برس ان کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اور ان کی روح پر عقیدت کے پھول نثار کرتے ہیں۔

حضرت عباسؓ ابنِ علیؓ

حضرت عباس ابن علی نہایت خوبصورت، بہادر اور وفادار تھے۔ ان کی والدہ فاطمہ کلابیہ عرب کے ایک مشہور بہادر خاندان کی خاتون تھیں۔

آپ بچپن ہی سے خدمتِ اسلام اور حضرت علی کی جنگی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ ۹ برس کی عمر میں جنگِ صفین میں جو حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہ کے درمیان واقع ہوئی شامل ہو کر دادِ شجاعت دی اور ہمیشہ اسلامی کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔

حضرت امام حسینؓ جب مکہ سے کوفہ کو روانہ ہوئے۔ تو اس مختصر قافلے کے ساتھ حضرت عباسؓ شامل ہو کر جاں سپارانہ خدمات

انجام دے رہے تھے۔ جب کربلا کے میدانوں میں یزید کے حکم سے ان پر پانی بند کر دیا گیا۔ دریا تک جانے کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے۔ تو حضرت عباس نے اس میدانِ ریگ میں کنواں کھدوانے کی کوشش کی۔ مگر دشمنوں نے یہ بھی نہ ہونے دیا۔

آخر جب عورتیں بچے پانی کے ایک ایک قطرہ کے لئے اس خشک اور بے آب وگیاہ میدان میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگے، تو حضرت عباسؑ ان کی اس رُوح فرسا اذیت کو سکونِ خاطر سے نہ دیکھ سکے۔ تلوار کمر سے باندھ۔ ایک ہاتھ میں علم اور دوسرے میں مشکیزہ لئے گھوڑے پر سوار ہو کر پانی لینے کو روانہ ہوئے۔

دریا پر دشمنوں کا پہرہ تھا۔ ان کو ہرچند سمجھایا۔ کہ معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں پر پانی بند کرنا انتہائی ظلم ہے۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ انسانیت سے کام لو۔

ان کے لئے یہ نصیحت وسمہ برابروئے کور کے مصداق تھی اس کا یہ اثر ہوا کہ تمام فوج نے اچانک تیر برسانے شروع کر دیئے آپ نے اس بے جگری سے اس حملہ کا جواب دیا کہ سب تتر بتر ہو گئے آپ نے فوراً پانی کا مشکیزہ بھر کر گھوڑے پر رکھا۔ اور خیمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ دشمن نے پھر تیر برسانے شروع کئے۔ آپ مشکیزے

کو سینے سے لگائے دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے کہ اچانک دشمن کے ایک سپاہی نے تلوار کے ایک وار سے آپ کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا۔ پھر آپ بائیں ہاتھ سے مقابلہ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ظالم نے بایاں ہاتھ بھی کاٹ ڈالا۔ اب آپ نے مشکیزہ دانتوں سے پکڑ لیا۔ اور علم کو سینے سے لگائے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اچانک ایک تیر مشکیزے میں لگا۔ اور سارا پانی بہ گیا۔ یہ دیکھ کر آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ کیونکہ آپ اسی قیمتی امانت کی خاطر اپنے دونوں ہاتھ کٹوا چکے تھے۔ تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ جسم چھلنی ہو رہا تھا۔ تلواروں کے زخموں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ ایک ظالم نے سر پر لوہے کے گرز کا وار کیا۔ آپ ڈگمگا کر زمین پر گر پڑے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جامِ شہادت نوش کر کے جنت الفردوس کو روانہ ہو گئے۔ حضرت امام حسینؑ یہ خبر پا کر موقع پر پہنچے۔ دشمن نے ان کی لاش کے کئی ٹکڑے کر دیئے تھے۔ اس لئے صبر و شکر کر کے رنج و غم کے آنسو بہاتے ہوئے اپنے خیمہ کو واپس چلے آئے

حضرت عباس نے حق رفاقت ادا کیا۔ اپنے بھائی اور اس کے اعزہ و اقارب پر اپنی جان نثار کر دی

عبداللہ بن زبیرؓ

خلافت امیہؓ کا خلیفہ عبدالملک اپنی سلطنت کو وسیع کرنا چاہتا تھا۔ اور اپنے مخالفین کو قتل کر کے اطمینان سے حکومت کرنے کا آرزومند تھا۔ ان کاموں سے فرصت پاکر عبداللہ بن زبیر کی طرف توجہ کی جو حجاز کا حکمران تھا۔ تاکہ وہ کل اسلامی سلطنت کا وارث بن جائے۔

عبدالملک نے حجاج بن یوسف ثقفی کے ماتحت پانچہزار جرار فوج کو عبداللہ بن زبیر کی سرکوبی کے لئے مکہ شریف بھیجا۔ حجاج بن یوسف نے شہر مکہ کی حدود میں داخل ہوتے ہی اعلان کر دیا کہ جو لوگ اطاعت قبول کریں گے۔ ان کو پناہ دی جائے گی۔ چنانچہ دو ہزار آدمی حجاج بن یوسف کے ساتھ اور ہو گئے اور سات ہزار

کا لشکر مکہ شریف کی طرف بڑھا۔ عبداللہ بن زبیر بھی مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے لیکن حجاج بن یوسف نے مکہ کا محاصرہ کر لیا۔ اور باہر سے مکہ شریف پر بارود اور پتھر پھینکنے شروع کر دیئے۔ عبداللہ بن زبیر اور ان کے ساتھیوں نے خوب مقابلہ کیا۔

حجاج بن یوسف نے آگ برسا کر خانہ کعبہ کو آگ لگا دی۔ تو عبداللہ بن زبیر بیت اللہ شریف سے نکل کر اپنے گھر کی طرف آئے آپ کی والدہ شریف اسما بنت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھیں جن کی عمر اس وقت نوے برس کی تھی۔ مگر جوانوں سے بڑھ کر دلیر اور شجاع، وہ بھی محصورین کے ساتھ دشمن سے مقابل تھیں اور اہل مکہ کو ہمت دلا رہی تھیں۔

حجاج بن یوسف نہایت سختی سے حملہ کر رہا تھا۔ مگر افسوس کہ عبداللہ بن زبیر کے ساتھیوں میں سے دس ہزار اور اس کے ساتھ چلے۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن زبیر کے دونوں بیٹے حمزہ اور خبیب نے بھی دشمن کے پاس جا کر پناہ لی۔ اس واقعہ سے عبداللہ ابن زبیر کی کمر ٹوٹ گئی۔ سامان حرب ختم ہونے کے قریب تھا۔ اور تمام ماتحت افسر بھی دشمن کی فوج میں چلے گئے تھے۔

اس یاس انگیز حالت میں عبداللہ نے اپنی والدہ محترمہ سے

مشورہ کیا۔ تو انہوں نے کہا:

"بیٹا! اگر تم حق پہ ہو۔ تو ہمت نہ ہارو۔ تمہارے والد بھی بہادر تھے۔ انہوں نے بھی میدانِ جنگ میں جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ عرب کے لئے ذلت کی موت مرنا باعث شرم ہے۔ بنی اُمیہ کے سامنے سر نیچا کر کے اپنے خاندان کو بدنام نہ کرنا۔"

عبداللہ بن زبیر نے اپنی شریف اور بہادر والدہ کے حکم کی تعمیل کی۔ اور ان کی پیشانی کو بوسہ دے کر کہا۔

"مجھے تم سے ایسی ہی اُمید تھی۔ دیکھو میری موت پر زیادہ غم نہ کرنا۔"

والدہ نے جواب دیا: "مجھے اللہ پر بھروسہ ہے۔ اور تمہیں اس کے سپرد کرتی ہوں۔"

غرض کہ عبداللہ بن زبیر اپنی والدہ سے رخصت حاصل کر کے دشمن کے مقابل ہوئے اور ایک ہی حملہ سے دشمنوں کو پیچھے دھکیل کر اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ جس طرف اپنی شمشیر خارا شگاف چلاتے دشمنوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیتے تھے۔ جب لڑتے لڑتے تھک گئے۔ تو کچھ دیر کے لئے رُک گئے۔ اتنے میں حجاج بن یوسف کی فوج

نے ایک زبردست حملہ کر کے۔ آپ کے تمام ہمراہیوں کو قتل کر ڈالا۔

اگرچہ ابن زبیر اب تنہا رہ گئے تھے لیکن دشمنوں میں سے کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ کہ بڑھ کر آپ کو گرفتار کریں۔ بلکہ دُور ہی سے تیروں کی بجائے پتھر پھینکنے شروع کئے۔

ادھر عبداللہ بن زبیر بھی پتھر کا جواب پتھر سے دیتے رہے آخر ایک پتھر آپ کی پیشانی پر لگا۔ جس سے آپ پر غشی طاری ہوگئی یہ حالت دیکھ کر جب دشمنوں نے نعرہ بلند کیا۔ تو آپ نے ہوش میں آکر دشمنوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"دیکھو! میرے زخم کا خون آگے کو گرتا ہے۔ پیٹھ پر نہیں گرتا" (یعنی ہم مقابلہ میں زخمی ہوئے ہیں۔ بھاگتے ہوئے زخمی نہیں ہوئے)

آخر زیادہ خون نکلنے کے باعث آپ کی طاقت زائل ہوگئی۔ اور دشمنوں نے نزدیک آکر آپ کو شہید کر دیا۔

اس اُولوالعزم بہادر کی شہادت کے بعد عرب کے تمام سردار عبدالملک سے جا ملے۔ صرف والیٔ خراسان نے اطاعت قبول نہ کی۔ عبدالملک نے عبداللہ بن زبیر کا سر مبارک عبداللہ بن ہبیرم

کے پاس روانہ کر کے اس کو عبرت دلا کر کہلا بھیجا کہ اگر تم میری اطاعت قبول نہ کروگے۔ تو تمہاری بھی یہی حالت ہوگی۔ لیکن، وہ عبدالملک کی اس حرکت سے سخت ناراض ہوا۔ عبداللہ بن زبیر کے سر مبارک کو غسل دے کر نہایت تکریم و تعظیم کے ساتھ مدینہ شریف میں خاندانِ زبیر کے پاس روانہ کر کے عبدالملک کے قاصد کو یہ جواب دیا

"عبدالملک سے کہہ دینا، کہ تم ظالم ہو۔ ظلم کا بدلہ خدا دے گا۔ میں تم کو بھی قتل کر دیتا۔ مگر قاصد ہونے کے خیال سے چھوڑتا ہوں۔"

محمدؐ بن قاسم

محمدؐ بن قاسم کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ بڑا بہادر بڑا دلیر اور اسلام کا سچا جاں نثار۔ حجاج بن یوسف والئے عراق و بصرہ کا داماد تھا۔

جب عبیداللہ بن بنسان ۹۲ھ میں سندھ میں دادِ شجاعت دیتا ہوا شہید ہوگیا۔ تو اس کی اس مہم کو سر کرنے کے لئے حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو سردارِ لشکر مقرر کر کے بھیجا۔

اس نے چھ سات سال اس قابلیت، شجاعت اور دانائی سے جنگ کی۔ کہ سندھ اور ملتان اور قرب وجوار کا تمام علاقہ اس کے زیرِ نگیں ہوگیا۔ کئی راجے قتل ہوئے۔ اور اطاعت قبول کر کے اسلام کے سائے میں آئے۔ یہ پہلا مسلمان فاتح تھا۔ جس نے

ہندوستان میں اسلامیت کا بیج بویا۔ جو رفتہ رفتہ پھوٹا، پھولا پھلا اور ایک ایک درخت بن گیا۔ جو تمام ہندوستان پر چھا گیا۔ یہ وہ علاقہ تھا۔ جہاں راجہ داہر کی حکومت تھی۔ کئی راجے اُس کے قرب و جوار میں حکومت کرتے تھے۔

جہاں رات دن مندروں میں گھنٹوں کی آواز سنائی دیتی تھی بتوں کے آگے پرار تھنا کی جاتی تھی۔ اب پانچ وقت "اللہ اکبر" کی صدا گونجنے لگی۔ اور اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔

محمد بن قاسم نے بہت سا مالِ غنیمت دار الخلافت میں بھیجا۔ غلام اور لونڈیاں وہاں پہنچائیں۔

خلیفہ ولید دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اور محمد بن قاسم کے مربی حجاج نے بھی داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

ولید کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ جو خاندانِ حجاج کا مخالف تھا۔ بعض حاسدوں کی غلط شکایات اور جھوٹی افواہیں سلیمان کے پاس پہنچیں۔ اس نے محمد بن قاسم کو جو تسخیرِ سندھ کے بعد ملکی نظم و نسق میں مصروف تھا معزول کر دیا۔ اور اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو مقرر کر کے سندھ روانہ کیا۔ یزید بہت جلد سندھ پہنچ گیا۔ وہاں جاتے ہی اس نے

محمد بن قاسم کو گرفتار کیا۔ اور اس فاتح سندھ کو ٹاٹ کے کپڑے پہنائے۔ ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔ اور معویہ بن مہلب کی حراست میں عراق کو روانہ کر دیا۔

جب محمد بن قاسم خلیفہ کے سامنے پیش ہوا۔ تو بغیر تحقیقات اور جواب طلبی کے سیدھا قید خانہ میں بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ اسیری کی حالت میں قید و بند کے مظالم جھیلتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہوا۔

خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا یہ ظالمانہ کارنامہ "تاریخ اسلام میں خلافت امیہ کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ چھ سات سال کی جاں سپارانہ خدمات، ایک عظیم ملک کی فتح، اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا یہ عجیب صلہ ہے۔ کہ اس کو مجرم بنا کر قید خانہ میں موت کا جام نوش کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔

خلیفہ سلیمان نے نہ صرف محمد بن قاسم کے ساتھ یہ افسوسناک سلوک کیا۔ بلکہ اور بھی بہت سے افسروں کو اس نے بلاوجہ موت کے گھاٹ اتارا۔ اور آخر خود بھی ۹۹ھ میں حکومت و ثروت اور جاہ و جلال چھوڑ کر زمین کے نیچے پناہ گزیں ہوا۔

حضرت عمر فاروق کا نام ان کی منکسر مزاجی، معدلت پروری، رعایا نوازی، سادگی اور انتظامی قابلیت کی وجہ سے مشہور ہے خلافتِ بنی اُمیہ کے دوران میں حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے۔ جنہوں نے فاروقِ اعظم کی یاد تازہ کر دی۔ اور اکثر جلیل القدر علماء کا خیال ہے۔ کہ خلفائے راشدین پانچ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے بعد عمر بن عبدالعزیز پانچویں خلیفہ تھے۔ جنہوں نے اپنی خوبیوں کی وجہ سے اسلام کی شان دوبالا کر دی۔

آپ سنہ ۶۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام عبدالعزیز بن مروان تھا۔ اور والدہ حضرت عمر کی پوتی تھی۔ مدینہ

میں تعلیم حاصل کی۔ اور علم میں کمال حاصل کیا۔ ان کے والد مصر کے گورنر تھے۔ ان کی وفات پر آپ کے چچا عبدالملک خلیفۂ وقت نے دمشق بلا لیا۔ اور اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دی۔

عبدالملک کے بعد اس کا بیٹا ولید خلیفہ ہوا۔ تو اس نے آپ کو مدینہ کا حاکمِ اعلیٰ مقرر کیا۔ ۹۳ھ تک مدینہ کے حاکم رہے۔ اس عرصہ میں امیرِ حج بن کر حج کو گئے۔

ولید اپنے بیٹے کو خلیفہ بنانا چاہتا تھا۔ مگر اصل حقدار اس کا چھوٹا بھائی سلیمان تھا۔ حضرت عمر نے اس معاملہ میں کھلے طور پر ولید کی مخالفت کی۔ اس نے ناراض ہو کر مدینہ کی گورنری سے علیحدہ کر کے تین سال قید کر دیا۔ لیکن پھر جب سلیمان خلیفہ ہوا تو اس نے آپ کو اپنا وزیرِ اعظم بنایا۔ اور مرتے وقت وصیت کی۔ کہ میرے بعد عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ بنایا جائے۔

جب سلیمان کی وصیت کے مطابق آپ خلیفہ بنائے گئے اور بیعت کے کام سے فارغ ہو کر گھر آئے۔ تو آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ بیوی نے پوچھا۔ کہ خیریت ہے؟

آپ نے فرمایا: خیریت کہاں۔ میرے کندھوں پر اُمتِ محمدی کی فلاح و بہبود کا سارا بوجھ ڈال دیا گیا ہے

اسی خوف سے رو رہا ہوں - کہ ایسا نہ ہو۔ قیامت کے
دن مجھ سے پوچھا جائے اور میں جواب نہ دے سکوں"۔

خلافت سے پہلے آپ امیرانہ لباس پہنا کرتے تھے۔ مگر خلیفہ ہونے پر حضرت عمر کی سی سادگی اختیار کر لی۔ آپ کے کرتے کو پیوند لگے ہوئے ہوتے تھے شاہی اصطبل کے گھوڑوں کی بجائے اپنے خچر پر سوار ہوتے تھے۔ خلیفہ ہونے کے فوراً بعد اپنی بیوی کو حکم دیا کہ اپنے زیورات شاہی خزانہ میں داخل کرا دے۔ آپ کا خیال تھا کہ اس کے باپ عبدالملک نے شاہی خزانہ سے تیار کراتے ہیں۔

آپ نے سب امیروں کو جمع کر کے حکم دیا۔ کہ "لوگوں کی چھینی ہوئی جائدادیں واپس کر دو۔ تم بیشک میرے رشتہ دار ہو۔ مگر میرے نزدیک غریب سے غریب مسلمان میں اور تم میں کوئی فرق نہیں۔ اسلام مساوات سکھاتا ہے۔ اور حضور نبی کریمؐ نے یہی تعلیم دی ہے"۔ بنو امیہ کو ان کا یہ حکم پسند نہ آیا۔ وہ دل سے ان سے دشمنی رکھنے لگے۔

نہایت اعلیٰ درجہ کے منتظم تھے۔ اور دیندار متقی لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔ جراح بن عبداللہ حاکم خراسان رمضان شریف

ین سفر کر کے حاضرِ دربار ہوا۔ آپ ناراض ہو گئے۔ اور فرمایا۔ رمضان گزرنے کا انتظار کیوں نہ کیا۔ یہ سفر اس کے بعد بھی ہو سکتا تھا۔ آپ کی نیکی اور انصاف پسندی کی بدولت آپ کی سلطنت، سندھ پنجاب، بخارا، ترکستان، چین سے لے کر مراکش، سپین اور فرانس تک پھیلی ہوئی تھی۔

مالک بن دینار کہتے ہیں کہ عمر عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو چرواہے تعجب سے دریافت کرنے لگے۔ "یہ کون شخص خلیفہ ہوا ہے کہ بھیڑیئے ہماری بکریوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتے۔"

ان کے عدل و انصاف سے لوگ اس قدر خوشحال تھے۔ کہ امیر لوگ صدقے۔ لے کر فقیروں کی تلاش میں پھرتے تھے۔ مگر کوئی لینے والا نہ ملتا تھا۔

آپ کی عادت تھی۔ کہ جب تک آپ کے پاس بیٹھنے والے لوگ سلطنت کے معاملات میں بات چیت کرتے۔ آپ بیت المال کا چراغ جلائے رکھتے لیکن جب وہ چلے جاتے۔ تو اسے گل کر کے اپنا چراغ جلاتے۔

خادم کو پانی گرم کرنے کے لئے کہا۔ وہ سرکاری باورچی خانہ

سے کر لایا۔ آپ کو علم ہوا۔ تو آپ نے ایک درم کی لکڑیاں سرکاری باورچی خانہ میں بھجوادیں۔

رجا بن حیات کہتے ہیں۔ کہ "ایک دن میں آپ کے پاس بیٹھا تھا۔ کہ چراغ گل ہوگیا۔ وہیں آپ کا خادم سو رہا تھا۔ میں نے چاہا۔ کہ جگا دوں۔ آپ نے منع فرمایا۔" پھر میں نے چاہا۔ کہ خود اٹھ کر چراغ جلا دوں۔" آپ نے فرمایا۔ "مہمان کو تکلیف دینا اچھا نہیں۔ خود اُٹھے۔ چراغ میں تیل ڈالا۔ اور جلا کر اپنی جگہ پر آ بیٹھے اور فرمایا۔

میں اب بھی وہی عمرؓ ہوں۔ جو پہلے تھا۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں میرے مرتبہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔"

آہ! اتنی فوجوں کے مالک، اسلام کے سچے پرستار، امت نبوی کے خادم رعایا کے ہمدرد کا مبارک وجود بعض حاسد اور کینہ توز لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ وہ گھات میں لگے تھے۔ آخر ایک دن اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اور ایک غلام کے ہاتھ سے انہیں زہر دلوا دیا۔ اس کے عوض غلام کو ایک ہزار اشرفی دی گئی۔ جب انہیں معلوم ہوا۔ تو غلام کو اپنے پاس بلایا۔ اور رشوت کی تمام اشرفیاں لے کر بیت المال میں بھجوادیں اور فرمایا۔ "جاؤ میں تمہیں اللہ کے لئے معاف اور آزاد کرتا ہوں۔" جب بیماری خطرناک صورت اختیار

کرنے لگی، تو یزید بن عبدالملک ولی عہد کے حق میں وصیت نامہ لکھوایا
"اَب مَیں آخرت کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ وہاں خدا تعالےٰ مجھ سے سوال کرے گا۔ حساب لے گا۔ اور مَیں اس سے کچھ چھپا نہ سکونگا اگر وہ مجھ سے راضی ہو گیا۔ تو مَیں کامیاب ہوں۔ اگر وہ راضی نہ ہوا۔ تو افسوس میرے انجام پر، تم کو میرے بعد تقویٰ اختیار کرنا چاہیئے۔ رعایا کا خیال رکھنا چاہیئے۔ تم میرے بعد دیر تک زندہ نہ رہو گے۔ ایسا نہ ہو کہ تم غفلت میں پڑ جاؤ۔ اور تلافی کا وقت ضائع کر دو"

اور اپنی اولاد کے لئے فرمایا "میرا اور ان کا وارث صرف خدا ہے۔ مَیں اسی کے سپرد کرتا ہوں، اگر یہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں گے تو وہ ان کے لئے کوئی سبیل نکالے گا۔ اگر یہ گناہوں میں مبتلا ہونگے تو مَیں انہیں مال و دولت دے کر ان کے گناہوں کو زیادہ نہیں کروں گا۔"

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف

پسرِ عبدِ عزیز اُموی، عدل میں ثانی ابن الخطاب
جب مِلا تختِ خلافت اُن کو ہو گیا گلشن گیتی، شاداب

ایک شب گھر سے چلے بہرِ نماز
پڑ گیا جب رُخِ عالم پہ نقاب

کوئی آوارہ وطن تند مزاج
صحنِ مسجد میں تھا آلودۂ خواب

پاؤں کا اُن کے ٹھوکا جو لگا
جاگ اُٹھا اور کیا اُس نے خطاب

"خیر ہے کیا کوئی مجنوں سا ہے تو
یا کہ کچھ ہے تری آنکھوں پہ حجاب"

ہنس کے فرمایا کہ مجنوں نہیں ہیں
کچھ نہیں مجھ میں جنوں کے اسباب

ہاں مگر ہو گئی مجھ سے تقصیر
آپ سے عفو کا طالب ہوں جناب

چوبداروں نے کیا اُس کو اسیر
چاہتے یہ تھے کہ دیں اُس کو جواب

آپ نے روک دیا اُن کو وہیں
پھر کیا اُن نے یہ آہستہ خطاب

اِس نے اِک بات فقط پوچھی تھی
جو مناسب تھا دیا میں نے جواب

بات قطعی تو نہیں اُس نے کہی،
پوچھنا کچھ نہیں شایانِ عتاب

اتنی سی بات پہ یہ جوش و غضب
اتنی سی بات پہ یہ خشم و عتاب

بیکسوں کو میں ستاؤں کیوں کر
مجھ کو دینا ہے قیامت میں جواب

(شبلی نعمانی)

حضرت امام ابو حنیفہ

حضرت امام ابو حنیفہ جو ایک بڑے عالم دین. فقیہ اور محقق تھے۔ پہلی صدی ہجری بمقام کوفہ پیدا ہوئے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان کی پیروکار ہے۔ جنہیں حنفی اہل سنت والجماعت اور سُنی کہا جاتا ہے۔

انہوں نے تحصیل علوم کے بعد کوفہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ بیشمار شاگرد بن گئے۔ اس وقت آپ کے پایہ کا کوئی عالم موجود نہ تھا۔ بڑے متقی، عابد، حق پرست، راستباز اور بے خوف تھے۔ چالیس برس عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ساری ساری رات خدا کے حضور میں کھڑے رہتے۔ کئی دفعہ ایک ایک رکعت میں سارا قرآن شریف ختم کیا۔ پچپن ۵۵ حج کئے۔ تیس سال تک

روزے رکھے۔

پہلے پہل آپ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ پھر چھوڑ دی یہاں تک کہ گوشہ نشین ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اسی دوران میں آپ کو سرورِ کائنات کی زیارت ہوئی۔ انہوں نے فرمایا:۔

ابو حنیفہ! تمہیں خدا نے میری سنت کو زندہ کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ دنیا ترک کرنے کا خیال چھوڑ دو۔ اور دنیا میں رہ کر اللہ کی نزدیکی حاصل کرو۔"

اس کے بعد آپ پھر خلق خدا کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

حضرت داؤد طائی کہتے ہیں کہ "میں بیس سال تک آپ کی خدمت میں رہا۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ سر ننگے بیٹھے ہوں۔ اور آرام لینے کے لئے کبھی تنہائی میں بھی پاؤں دراز کئے ہوں۔"

میں نے عرض کیا۔ کہ حضرت! اگر آپ تنہائی میں پاؤں پھیلا کر بیٹھ جائیں تو کیا حرج ہے۔"

فرمایا "تنہائی میں خدا سے شرم کرنا اصل تقویٰ ہے۔"

حضرت امام ابو حنیفہ کے زمانہ میں خلافتِ عباسیہ کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور کی حکومت تھی۔ آپ سچ بولتے تھے اور دوسروں کو سچ بولنے کا حکم دیتے۔"

ایک دفعہ ابوحنیفہ منصور نے کوئی تحریر لکھوائی۔ جس میں بعض افسروں کو بعض محکمے سپرد کئے گئے تھے۔ یہ کاغذ خادم کو دیا کہ فلاں فلاں مسلمان کی گواہی کرالو۔ ان میں حضرت امام صاحب کا نام بھی تھا جب شاہی خادم ان کے پاس پہنچا۔ تو آپ نے فرمایا کہ "جب تک امیر المومنین کے سامنے ہو کر پوچھ نہ لوں۔ کہ یہ تحریر آپ نے لکھوائی ہے۔ اس وقت تک گواہی نہ کروں گا۔ یا امیر المؤمنین مجھے اپنے پاس بلالیں۔ یا خود آئیں۔ تاکہ میں دریافت کر سکوں"

نوکر ذرا بگڑا۔ کہ باقی علما نے دستخط کر دیئے ہیں۔ آپ کیوں نہیں کرتے۔ مگر آپ نہ مانے۔

خلیفہ کو معلوم ہوا۔ تو آپ نے ان کے استاد شیعی کو بلایا۔ جو اس وقت سب سے بڑا قاضی تھا۔

پوچھا "گواہی میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونا ضروری ہوتا ہے۔"

کہا "ہاں" خلیفہ نے کہا "پھر آپ نے مجھے دیکھے بغیر گواہی کیوں کر دی"

قاضی صاحب گھبرائے اور آئیں بائیں کرنے لگے

خلیفہ نے اسی وقت ان کو قاضی کے منصب سے علیحدہ کر

دیا۔ اور حضرت امام کو بلا کر ان کی سچائی کی تعریف کی اور یہ عہدہ اُن کی خدمت میں پیش کیا۔

امام صاحب منکسر مزاج تھے اور دنیاوی شان و شوکت سے گھبراتے تھے آپ نے انکار کر دیا۔ بلکہ اس زمانہ کے سب سے بڑے علماء میں سے ایک شخص شریح نے جو امام کا دوست تھا۔ یہ عہدہ قبول کر لیا۔ آپ نے اس سے میل جول بند کر دیا۔

خلیفہ منصور عباسی سے پہلے ہر شہر میں ایک قاضی ہوتا تھا۔ خلیفہ منصور نے دار الخلافت میں قاضی القضاۃ (چیف جج) کا نیا عہدہ قائم کیا۔ جس کے لئے حضرت امام سے بڑھ کر کوئی قابل نہ تھا مگر امام صاحب نے انکار کر دیا۔

منصور طبیعت کا سخت تھا۔ اس نے اس انکار کو حکم عدولی اور نافرمانی سمجھا۔ اور حضرت کو قید کر دیا۔ انہوں نے اس حکم کو خوشی سے منظور کیا۔ مگر اپنے ضمیر کے خلاف قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول نہ کیا۔ اور اس اعزاز پر قید خانہ کی زندگی کو ترجیح دی۔

۱۵۰ھ میں انہیں قید خانہ ہی میں زہر دے کر واصل بحق کیا گیا۔

فاتحِ اندلس

ولید کے عہدِ خلافت میں طارق بن زیاد مصر کے ایک ضلع طنجہ کا حاکم تھا۔ جو نہایت منتظم، جنگ آزمودہ اور دلیر شخص تھا۔ گورنر مصر موسیٰ ابن نصیر نے طارق کو ۹۲ھ میں سواحل ہسپانیہ کی طرف روانہ کیا۔ اور اسی مہم میں فتوحات حاصل کرتا ہوا، اندلس کے قریب پہنچا۔ تو ساحل پر فوج اتار دی۔ اور حکم دیا: "کہ کشتیاں جلا دو۔"

اس واقعہ کو حضرت اقبالؒ نے نہایت خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بنگاہِ خرد خطاست

دور یم از سوادِ وطن باز چوں رسیم
ترکِ سبب بروئے شریعت کجا روا ست
خندید و دست بر سرِ شمشیر بُرد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

اندلس میں ان دنوں قوم گاتھ آباد تھی۔ اس قوم کا سردار کونٹ جولین تھا جس نے طارق کا مقابلہ کیا۔ مگر بہادرانِ اسلام کے حملہ کی تاب نہ لا کر شہرِ قیوط کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوا۔ لیکن بہادر طارق نے بجلی کی طرح شہر قیوط کو محاصرہ میں لے لیا۔ آخر کونٹ جولین نے اس محاصرہ سے تنگ آکر نہ فقط قلعہ قیوط کو مسلمانوں کے قبضہ میں دینے کا وعدہ کیا۔ بلکہ شہر اندلس کو بھی بہادرانِ اسلام کی نذر کر کے امان حاصل کرنے کی استدعا کی اس استدعا کے مطابق طارق مع اپنے کئی سو مسلمانوں کے جہاز پر سوار ہو کر جزیرہ الخضر میں گیا۔ جہاں کونٹ جولین کے قول کی سچائی کی تصدیق کی گئی۔ اور مسلمانوں کا اندلس پر تسلط ہو گیا۔ طارق کو اس عظیم الشان فتح کی نہایت خوشی ہوئی اور اس فتح کی یادگار میں اس نے اندلس کے کنارے جبرالٹر (یہ پہاڑ مثلث شکل کا سمندر میں واقع ہے) پر ایک مستحکم

قلعہ بنایا، جو جبل الطارق کے نام سے مشہور ہے۔ علاوہ
اندلس شہر کے کشتیل، قسطان سے لے کر پرتگال کے علاقہ میں
بہادرانِ اسلام نے اپنا اسلامی پرچم لہرا دیا۔

طارق کے پاس معمولی فوج۔ مختصر سامانِ جنگ۔ وطن سے
دور۔ دیارِ غیر۔ مگر اس نے خدا پر بھروسہ کر کے اسلامی جوش
سے کام لے کر۔ حق و صداقت کے بل پہ اس قدر بہادری دکھائی کہ
ملک پر تسلط ہو گیا۔ مضبوط۔ مخالف اور پائدار مسیحی حکومت کے
پاؤں اکھڑ گئے۔ آج طارق دنیا میں نہیں۔ مگر اس کے لاثانی کارنامے
ہمیشہ یادگار رہیں گے ع

مردوں کا آسمان کے تلے نام رہ گیا

بایزید یلدرم

خاندانِ عثمان کا ہونہار اور قابل ترین فرزند بایزید ۷۹۲ھ میں روم پر حکومت کر رہا تھا۔ جسے خلیفۂ اسلام المتوکل علی اللہ نے جس کا پایۂ تخت مصر تھا۔ اسے سلطانِ روم کا خطاب دیا۔

بایزید بڑا نیک۔ شریف اور بہادر تھا۔ جس نے سلطنت عثمانیہ کی بنیادیں استوار کیں اور اپنے عہدِ حکومت میں رعایا کی خوشحالی اور فراغبالی میں خاص توجہ دی۔ سلطنت کا نظام نہایت بیدار مغزی سے قائم کیا۔ سلطنت کی توسیع کی۔ اور دشمنوں کے حملوں کا دندان شکن جواب دیا۔ جو مقابل آیا۔ اسے شکست فاش دی۔

خاندانِ عثمان کی ترقی خوشحالی اور حکومت بایزید کے عہد سے شروع ہوئی۔ جو رفتہ رفتہ تمام دنیا میں مشہور ہو گیا جس کا اقتدار

یورپ اور ایشیا میں مسلم تھا۔ اور بڑے بڑے مسیحی تاجدار خلفائے عثمانیہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوئے۔

دشمن سے سلوک:۔ ترکوں کی فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا کہ بالآخر یورپ کے عیسائی حکمران مل کر بایزید کے مقابلے کو نکلے۔ لیکن انہوں نے شکست کھائی۔ جنگی قیدیوں میں ڈیوک آف برانڈی کا بیٹا جان کونٹ ڈی نیوا س بھی تھا۔ وہ اور اس کے چوبیس ساتھی ایک سال تک بایزید کی حراست میں رہے۔ اور انہیں ان کی حیثیت کے مطابق عزت و احترام سے رکھا گیا۔ جونہی فرانس سے زرِ فدیہ آ گیا۔ انہیں وطن جانے کی اجازت دے دی گئی۔ جب یہ لوگ رخصت ہونے لگے۔ تو بایزید نے انہیں مخاطب کر کے کہا:۔

"جان! مجھے خوب معلوم ہے۔ کہ تو اپنے ملک میں ایک بڑا سردار اور طاقتور رئیس کا بیٹا ہے۔ تو نوجوان ہے۔ اور ابھی تیرے لئے امید کے بہت سے سال باقی ہیں۔ ممکن ہے۔ میدانِ جنگ میں تیری اس پہلی کوشش کی ناکامی پر لوگ تجھے قابلِ الزام ٹھہرائیں اور تو اس اتہام کو رفع کرنے اور اپنی شہرت و نیک نامی

کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے ایک طاقتور فوج کو اکٹھا کر کے میرے مقابلہ میں جنگ کے لئے آئے۔ اگر میں تجھ سے ڈرتا۔ تو تجھ سے اور تیرے ساتھیوں سے تیرے ایمان اور عزت پر حلف لے لیتا کہ نہ تو اور نہ وہ کبھی میرے مقابلے پر ہتھیار اٹھائیں گے لیکن نہیں میں ایسے حلف کا مطالبہ نہ کروں گا۔ برخلاف اس کے میں خوش ہوں گا۔ اگر تو اپنے ملک میں واپس پہنچ کر ایک فوج جمع کرے۔ اور اسے لے کر یہاں آئے۔ تو مجھے ہمیشہ میدانِ جنگ میں اپنے مقابلہ کے لئے تیار پائیگا جو بات میں اس وقت کہہ رہا ہوں۔ اسے جس شخص سے بھی چاہے کہ دینا کیونکہ میں ہمیشہ جنگی کارناموں نیز اپنی فتوحات کو وسیع کرنے کے لئے تیار اور خواہشمند رہتا ہوں۔

بایزید کا انجام بہت عبرت ناک ہے۔ حالات نے اس قدر پلٹا کھایا۔ کہ بایزید سلطان تیمور کے سامنے دست بستہ لایا گیا جب بایزید سامنے آیا۔ تو تیمور نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ اور اس کے ہاتھ کھلوا کر عزت و احترام کے ساتھ اپنے قریب بٹھایا۔ پھر

اس کی حالت پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا
کہ اگرچہ احوال عالم تمام تر خداوند تعالیٰ کے ارادۂ قدرت کے مطابق
پیش آتے ہیں۔ اور کسی دوسرے کو حقیقتاً کوئی اختیار و اقتدار
حاصل نہیں ہے۔ تاہم انصاف اور حق یہ ہے کہ تم پر جو مصیبت
آئی ہے۔ وہ خود تمہاری لائی ہوئی ہے۔ تم نے بارہا اپنی حد سے باہر
قدم رکھا۔ اور بالآخر مجھے انتقام پر مجبور کر دیا۔ پھر بھی چونکہ تم کفار سے
جہاد کر رہے تھے۔ میں نے بہت تحمّل کیا۔ اور ان حالات میں جو فرض
ایک خیر اندیش مسلمان کا تھا۔ اسے بجا لایا۔ میری خواہش تھی کہ اگر
تم فرمانبرداری کی راہ اختیار کرو۔ تو مال و لشکر کی جس قدر ضرورت
تمہیں ہو۔ اس سے تمہاری مدد کر دوں۔ تاکہ تم اطمینان و قوت کے
ساتھ جہاد میں مشغول رہ سکو۔ اور دیارِ اسلام کے اطراف و اکناف
بے دینوں کے شرک کی شرکت کو فنا کر دو۔ لیکن تم نے سرکشی اور عناد
اختیار کیا۔ حتیٰ کہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا۔ سب جانتے ہیں کہ اگر
صورت حال اس کے برعکس ہوتی۔ اور یہ قوت و غلبہ جو خداوند تعالیٰ
نے مجھ کو بخشا ہے۔ تم کو حاصل ہوتا۔ تو اس وقت مجھ پر اور میرے
لشکر پر کیا گزرتی۔ لیکن فتح کے شکرانے میں جو خدا کے فضل و کرم سے
مجھے حاصل ہوئی ہے۔ میں تمہارے اور تمہارے آدمیوں کے ساتھ

بھلائی کے ساتھ کچھ نہ کر سکوں گا

بایزید کا انجام:۔ بایزید کو تیمور نے خلعتِ شاہانہ پہنا کر اس کے لئے اپنے خیمے کے قریب ایک عالیشان خیمہ نصب کروا دیا۔ شہزادہ موسیٰ جو قید میں تھا۔ اسے آزاد کر کے باپ کے پاس رہنے کی اجازت دیدی۔ حرم سلطان کو اس خیمے میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن یہ شاہی عنایات بایزید کے زخمی دل پر نمک کا کام دے رہی تھیں اور شاہی خیمہ اس کے لئے قید خانہ تھا۔ کہاں وہ سلطانی جاہ وجلال اور کہاں یہ حالت کہ رات دن خیمے میں پڑے رہو۔

بایزید کے لئے یہ حالت ناقابل برداشت ہوگئی اور مضطرب ہوگیا۔ اور نکل بھاگنے کا عزم کر لیا۔ لیکن اس کی اطلاع تیمور کو مل گئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ بایزید کی نگرانی سختی کے ساتھ ہونے لگی۔ تاتاری لشکر جب ایک مقام سے دوسرے مقام کو کوچ کرتا تو تیمور بایزید کو بھی ساتھ رکھتا۔ بایزید ایک پالکی میں سفر کرتا تھا۔ جس پر پردہ پڑا رہتا تھا۔ اس پالکی میں لوہے کی جالی کا کام تھا۔ جس کی بنا پر مشہور ہوگیا کہ تیمور قیدی سلطان کو لوہے کے پنجرے میں بند رکھتا ہے اور جہاں جاتا ہے۔ اپنے ساتھ اس کو پنجرے میں لے جاتا ہے۔

بایزید کے لئے یہ حالت ناقابلِ برداشت ہوتی گئی۔
اور آٹھ ماہ اس قید میں رہ کر ہمیشہ کے لئے آزاد ہوگیا تیمور
کو جب اس کی اطلاع ہوئی۔ تو وہ آبدیدہ ہوگیا۔ کیونکہ فاتح سلطان
کا انجام کتنا حسرت ناک تھا۔ جس نے لاکھوں انسانوں کو قتل
کرا دیا تھا۔ اور اس کا دِل کبھی نہ لرزا تھا۔ تیمور نے موسیٰ (فرزند
بایزید کو جو باپ کے ساتھ قید تھا) کو آزاد کر کے بایزید کی نعش
شاہانہ احترام کے ساتھ بروصا کو روانہ کی۔ جہاں اس کو سابق
تاجدارانِ عثمانی کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

افسوس ہے کہ تیمور اور بایزید کی باہمی چپقلش نے ایک
زبردست تاجدار کی جان لی۔ جس نے اسلام کی شان و شوکت
بڑھانے اور اسلامی حکومت کو وسیع کرنے میں نہایت ہمت و
جرأت اور عقل و تدبر سے کام لیا تھا۔

حافظ پاشا کا قتل

سلطان مراد رابع (۱۰۳۲ھ تا ۱۰۵۰ھ) کا عہدِ حکومت تھا۔ اور وزارتِ عظمیٰ پر حافظ پاشا مقرر تھے کہ فوج نے بغاوت کر دی اور انہوں نے قصرِ سلطانی کے سامنے جمع ہو کر حافظ پاشا کے قتل کا مطالبہ کیا۔ سلطان نے باغیوں کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر کار سلطان نے مجبور ہو کر حافظ پاشا کو بلا بھیجا۔ اور باغیوں کا مطالبہ بتایا۔ یہ سن کر حافظ پاشا نے جواب دیا:۔

"میرے آقا! حافظ جیسے ہزاروں غلام آپ پر نثار! میری استدعا صرف یہ ہے۔ کہ آپ اپنے ہاتھ سے قتل نہ کریں۔ بلکہ مجھے ان باغیوں کے سپرد کر دیں

تاکہ مجھے شہادت کا مرتبہ نصیب ہو۔ اور میرے بے گناہ خون کا وبال ان پر ہو۔"

اس کے بعد حافظ پاشا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھتے ہوئے نہایت دلیری سے آگے بڑھے۔ یہ منظر اس قدر رقت انگیز تھا۔ کہ سلطان اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ سارے درباری بھی اشک بار تھے۔ اور مردِ مجاہد باغیوں کے بے رحم حلقے میں جا کر شہید ہو گیا۔ اور اس کا سر کاٹ لیا گیا۔

جب ہنگامہ ختم ہوا۔ تو سلطان نے کہا۔ "خدا کی مرضی پوری ہوئی۔ لیکن اے خونخوار انسانو! جو وقت اس نے مقرر کیا ہے۔ اس وقت تم سے بھی انتقام لیا جائے گا۔ تمہیں نہ خدا کا خوف ہے۔ نہ رسول کی شریعت کا احترام۔"

اندلس کے مسلمانوں پر مظالم

اندلس میں پونے آٹھ سو سال حکومت کرنے کے بعد لرزہ خیز مظالم وہاں کے مسلمانوں پر ہوئے۔

یوں تو ابو عبداللہ کے الحمرا کے دروازوں سے رخصتی کے بعد ہی غرناطہ کے مسلمان مردوں اور عورتوں پر عیسائی پادریوں اور سپاہیوں کے مظالم شروع ہو گئے تھے۔ ان کی آبرو لٹنے لگی تھی۔ اور ایمان پر جبر کے کلہاڑے چلنے لگے تھے۔ لیکن ان کی ابتدا کا سنگین دور وہ ہے۔ جب قشتالیہ کے کلیسا کا ایک بڑا پادری غرناطہ کے اس منصب پر فائز ہوتے ہی مسلمانوں کے متعلق جو حکمتِ عملی وضع کی۔ اس کا نتیجہ دوسرے ہی دن ظاہر ہو گیا پادریوں اور سپاہیوں کی ٹولیاں مسلمانوں کے محلوں

میں گھس گئیں۔ اور متقی اور عزت مند مسلمانوں کو ان کی ڈاڑھیوں اور سر کے بالوں سے پکڑ پکڑ کر بڑے بازاروں میں لانے لگے۔ ان میں جو بازاروں میں پہنچ کر عیسائی بننے پر تیار ہو جاتے وہ بچ جاتے اور جو تامل اور تذبذب کا اظہار کرتے۔ ان کی پیٹھیں کوڑوں سے سہلائی جاتی تھیں۔ جو اس سختی کے باوجود ثابت قدم رہتے۔ ان کو زنجیروں میں جکڑ کر کھڑا کر دیا جاتا۔ اور لڑکوں بالوں اور نوجوانوں کو حکم ملتا کہ پتھروں سے ان کی تواضع کریں۔ اس تشدد کے باوجود کچھ ایسے مستقل مزاج اور جری مسلمان ابھی باقی تھے۔ جو پتھروں کی بارش میں بھی محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور بزرگی کے نعرے بلند کرتے۔ ان جری مسلمانوں کو ایک اور سزا ملتی۔ ان کے لئے بیچ بازار میں الاؤ جلائے جاتے اور ان بہادر جی داروں کو ان میں پھینک کر ان کی بہادری و جرأت کی داد دی جاتی۔ اس طریق پر غرناطہ کے مسلمان فقہا اور علما اور ممتاز مسلمان برداشت نہ کر سکے۔ ہر گلی اور کوچہ میں تکبیریں بلند ہونے لگیں۔ گلیوں کے موڑ مجمعوں سے بھر گئے۔ اس احتجاج کو جس طرح دبایا گیا۔ غرناطہ کی تاریخ کا وہ باب بھی بڑا ہی المناک ہے۔ فقہا کی ڈاڑھیوں کا ایک ایک بال نوچا گیا۔ ان کے گھروں کی عورتوں کے لباس پارہ پارہ

کئے گئے۔ ان کی اوڑھنیاں شراب کے رنگ میں رنگی گئیں۔ اور عیسائی سپاہیوں نے ان جوان عورتوں کی کھلے بندوں بے حرمتی کی۔

یہ اسقفِ اعظم شمشین کے حلم اور رواداری کے عام مظاہر تھے۔ اسقفِ اعظم کی شرافت اور علم دوستی کا اصل حال تو اس دن کھلا۔ جب غرناطہ کے ہر مسلمان گھر کی تلاشی لی گئی۔ اور سپاہیوں نے غرناطہ کے مسلمان گھروں میں سے دس لاکھ قرآن پاک اور عربی زبان کی نادر کتابیں برآمد کیں۔ یہ کتابیں مسلمانوں کی آٹھ سو سال حکومت اور علمی اور فنی ترقیوں کا ماحصل تھیں۔ یہ سائنس، طب، حکمت، فلسفہ، زراعت، تجارت، دواسازی کے شہ پارے مسلمان قوم کی سب سے گراں قدر اور بیش قیمت پونجی تھی۔ یہ پونجی چوک میں ڈھیر کر دی گئی۔

اس چوک میں یہ دس لاکھ قرآن پاک کے نسخوں اور دس لاکھ کتابوں کے ڈھیر پر تیل چھڑ کا گیا۔ پھر مقدس اسقفِ اعظم نے اپنے پاک ہاتھوں سے اس ڈھیر میں آگ لگائی۔ دیکھتے دیکھتے ہی شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اور عیسائی سپاہی جو چاروں طرف پھیلے اس آگ کا تماشا کر رہے تھے۔ خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ اُدھر

آگ پھیلتی رہی۔ اِدھر عیسائی مذہب کے یہ علمبردار خوشی و مسرت کا ناچ ناچتے رہے۔

غرناطہ کے مسلمانوں نے ہر ذلت سہہ لی تھی۔ ہر نقصان برداشت کرلیا تھا۔ مگر یہ تباہی ان کے دلوں کو کھا گئی۔ اِدھر آگ پھیلی اُدھر ان کے سینے میں شعلے بھڑکنے لگے۔ عورتیں بچے اور بوڑھے گھروں سے نکل آئے۔ ان کے پاس ہتھیار نہ تھے۔ محض چھریاں، چاقو اور عام استعمال کے ڈنڈے تھے۔ ان ڈنڈوں سے مسلح ہوکر غرناطہ کے مسلمانوں نے اس مہذب قوم کے ساتھ غرناطہ کی بے مثال جنگ کی۔

مگر یہ لڑائی نہتوں کی ایک لاکھ مسلح سپاہیوں کے خلاف تھی۔ یہ لڑائی بہت جلد ٹھنڈی پڑ گئی۔ مسلمان مرد اور عورتیں، زنجیروں میں جکڑ دیئے گئے۔ عورتوں کے لباس پرزے پرزے ہوئے۔ مردوں کی داڑھیاں نچیں۔ ان کے جسم عضو عضو کر کے کاٹے گئے۔

تہذیب و تمدن کا یہ مظاہرہ یا خون کی یہ ہولی کئی دن تک متواتر کھیلی گئی۔ پادریوں نے اس ہولی میں سب سے زیادہ خون بہایا۔

عیسائی مؤرخین کے بیان کے مطابق اس دن کے بعد ستر ہزار مسلمانوں کو جبراً بپتسمہ دیا گیا۔ دس دس ہزار مسلمان ایک ایک وقت میں عیسائی بنائے گئے ۔ اس تبدیلی مذہب کی حیثیت محض ایسی تھی جیسے کسی کم سن بچے کو زبردستی پہلا لباس اتار کر دوسرا لباس پہنایا جائے۔

غرناطہ کے مسلمان عیسائی تو ہو گئے۔ مگر ان کے دل مسلمان ہی رہے۔ وہ انجیل پڑھتے۔ وہ گرجوں میں جاتے۔ مسیحی رسوم ادا کرتے۔ مگر پھر بھی اندر سے مسلمان تھے وہ چھپ چھپ کر دروازے بند کر کے گھنے پردے ڈال کر قرآن کی آیات پڑھتے اور زار و زار روتے۔

اکثر ایسا ہوا کہ پادریوں کے جاسوسوں نے ان میں سے بعض کو نماز پڑھتے یا قرآن پاک کی تلاوت کرتے دیکھ لیا۔ انہیں اس جرم کی پاداش میں خوفناک سزائیں دی گئیں۔ انہیں چوک میں کھڑا کر کے بید مارے گئے۔ ان کے منہ پر تھوکا گیا۔ انہیں سور کھانے کو ملا۔ مگر سزاؤں کے باوجود اسلام اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ان کے دلوں سے نہیں نکلی۔ وہ مسیح کے صلیب پر چڑھائے جانے کے جھوٹے افسانے پڑھتے۔ تو ان کی زبانیں لڑکھڑا جاتیں۔ وہ صلیب کے سامنے

دو زانو ہوتے وقت رکوع کے بل ہو جاتے۔ یہ بڑے جبر کی زندگی تھی۔ یہ ایک عجیب امتحان تھا۔ جس میں یہ بدنصیب مسلمان مبتلا تھے ان کی اس پریشانی اور ابتلائی روداد نے خوب شہرت پائی۔ غرناطہ میں بسنے والے مسلمانوں کے دل زخمی ہو گئے۔ اور سارے مفتوحہ علاقے خاص طور پر دالیش، رونڈار اور البشارہ میں ایک خوفناک ہیجان پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں نے ہتھیار اٹھائے اور عیسائی فوجوں کے مقابلہ میں صفیں باندھ لیں۔ ان کے مقابلہ کے لئے ایک لاکھ سپاہیوں کی جرار فوج قرطبہ سے چلی۔ وہ جدھر سے گذری۔ بستیاں جلاتی کھیت ویران کرتی گئی۔ اس نے ہر ہر مقام پر آگ کے الاؤ جلائے اور ان میں بچوں اور عورتوں کو پھینک کر دیوانہ وار قہقہے لگائے

مسلمانوں نے نہایت پامردی اور استقلال سے ان مصائب کا مقابلہ کیا۔

دو شہیدانِ ملت

سیّد احمد اور سیّد اسمٰعیل

اٹھارھویں صدی عیسوی میں جبکہ مسلمانانِ ہند گوناں گوں مصائب میں گرفتار تھے۔ سید احمد بریلی میں پیدا ہوئے۔ جوں جوں بڑے ہوتے، اور تعلیم حاصل کی۔ جذبۂ ملی و روحِ اسلامی ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ قرآنِ کریم اور دیگر مذہبی کتب پر عبور حاصل کیا جوان ہوئے تو فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اس فوج کا سالار امیر خان پنڈاری تھا۔ سید احمدؒ نے سات سال فوج کی ملازمت کی تین ہزار فوجی سپاہیوں کو پکا مسلمان بنا دیا۔ اور وہ سب کے سب اس کے مریدوں کے حلقے میں داخل ہو گئے۔

امیر خاں کی ملازمت چھوڑ کر آپ دلی چلے گئے جہاں شاہ ولی اللہ

کے خاندان کے ایک نوجوان شاہ اسمٰعیل سے ملاقات ہوگئی۔ جو ایک بڑے عالم اور بہادر سپاہی تھے۔ وہ سید احمد کی تعریف پہلے سن چکے تھے۔ فوراً مرید ہو گئے۔ شاہ اسمٰعیل ابھی نوجوان تھے۔ مگر ان کے کلام میں بڑی تاثیر تھی۔ لوگ دور دور سے حصولِ رشد و ہدایت اور تحصیلِ علم کے لئے اُن کے پاس آتے تھے۔

سید احمد اور شاہ اسمٰعیل کو پنجاب میں سکھوں کے مظالم اور مسلمانوں کی تباہی کی لرزہ خیز خبریں آتی تھیں۔ یہ ان اعلانات کو برداشت نہ کر سکے۔ اور سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں کے پاس دس فیصدی مسجدیں تھیں۔ باقی پر سکھوں کا قبضہ تھا۔ وہ مساجد کی بے حرمتی کرتے۔ ان میں گدھے گھوڑے اور کُتے باندھتے تھے۔ اذان دینے کی اجازت نہ تھی۔ مسجدوں کا مرمت کرنا منع تھا۔ مسلمان قربانی نہ دے سکتے تھے۔ عموماً قرآن جلائے جاتے تھے۔ اگر کوئی قربانی دیتا۔ تو اس کو حکم تھا کہ بجائے اللہ اکبر کے نانک کا نام لے کر چھری چلائے۔ مسلمان کسانوں کے کھیتوں میں مویشی چرایا کرتے اور اُن کی کھیتیاں برباد کر دیا کرتے تھے۔ مسلمان لڑکیوں کی عزت ہر وقت خطرے میں تھی۔ رنجیت سنگھ اور سکھ سرداروں کے گھروں میں سینکڑوں مسلمان عورتیں تھیں

پشاور کے علاقے میں سکھ فوجوں نے فتوحات حاصل کیں۔ تو مسلمان عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو آگ میں ڈال دیا۔ نیزوں پر چڑھا کر توپوں کے آگے باندھ کر، غرض بہت بے دردی سے مارا اور ایسے ظلم ڈھائے جن کے اظہار کا زبانِ قلم میں یارا نہیں۔

سید صاحب کے منہ سے جہاد کا اعلان ہونا تھا کہ ان کے ہزاروں مرید اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پٹنہ، دہلی، کلکتہ اور بریلی کے علاقوں کے بے شمار آدمی شامل ہو گئے۔

شاہ اسمٰعیل کو اس جانباز لشکر کا سپہ سالار بنایا گیا۔ اور ۱۲۴۲ھ میں یلغار کرتا ہوا یہ لشکر پشاور پہنچا۔ نوشہرہ کے مقام پر پہلی لڑائی ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے اپنے جرنیل بدھ سنگھ کے ساتھ دس ہزار سپاہی بھیجے۔ مسلمانوں نے زبردست حملہ کیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سکھ مقابل کی تاب نہ لا سکے۔ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے! اور ڈھائی ہزار سکھ کھیت رہے۔ یہ خبر سُن کر رنجیت سنگھ حیران رہ گیا اور بہت سی فوج بدھ سنگھ کی مدد کو بھیجی۔ اس کے ساتھ ہی پشاور کے علاقہ میں شیعہ سرداروں کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ ان لوگوں کی غداری سے مسلمانوں کو مشکلیں پیش آئیں۔ مگر انہوں نے کوئی پروانہ کی۔ اور جہاد میں مصروف رہے

کئی دفعہ ایسا ہوا۔ کہ انہیں لگاتار کئی کئی ہفتے جنگل کی بوٹیاں اور درختوں کی چھال اُبال کر کھانی پڑی۔ اور بہادری کے وہ کارنامے دکھائے کہ تاریخ میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔

ڈمگاہ کے مقام پر شاہ اسمٰعیل نے صرف ایک سو بہادروں کے ساتھ سکھوں کی دو ہزار فوج گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دی۔ جب سکھ جرنیل مجاہدین کی فوجوں کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے۔ تو رنجیت سنگھ نے ایک تجربہ کار فرانسیسی جرنیل ونطورا کو فوج دے کر بھیجا۔ اس نے وعدہ کیا کہ میں سید احمد اور شاہ اسمٰعیل کو زندہ گرفتار کر کے لاؤں گا۔ گولہ بارود اور سامانِ جنگ کا کوئی حساب نہ تھا۔ کئی ہزار فوج تھی۔ ادھر اسلامی فوج میں صرف تیرہ سو نوجوان باقی رہ گئے تھے۔ کئی دن گھمسان کی جنگ ہوئی۔ فرانسیسی توپخانہ مجاہدین کے قبضہ میں آ گیا۔ اور جنرل ونطورا اپنا کیمپ چھوڑ کر لاہور کی طرف بھاگ گیا۔

اس فتح سے تمام سرحد میں مجاہد فوج کی دھاک بیٹھ گئی سکھ فوجیں یہ تمام علاقہ چھوڑ کر بھاگ گئیں۔ پنجاب میں سید احمد اور شاہ اسمٰعیل کا نام سن کر لوگ کانپ اٹھتے تھے۔ یہاں امن قائم کرنے کے بعد سید احمد صاحب کا ارادہ تھا کہ لاہور پر حملہ کریں

رنجیت سنگھ مسلمانوں کی یہ کامیابی دیکھ کر آگ بگولہ ہوگیا۔ اس نے بعض غدار مسلمانوں کو رشوت دیکر سید صاحب کی حکومت کے خلاف نفرت پھیلانی شروع کی۔ لوگ قانونِ شریعت کی سختی سے گھبراتے تھے اس لئے وہ اس چال میں جلدی کامیاب ہوگیا اور لوگ باغی ہوگئے۔ سید صاحب کی حکومت کے افسر جابجا قتل ہونے لگے۔ مجاہدین جو حکومت کا انتظام کرنے کے لئے دور دور بھیج دیئے گئے تھے۔ سرحد کے مسلمانوں نے چن چن کر مار ڈالے۔ بخود سید احمد اور شاہ اسمٰعیل کی جان کے لالے پڑ گئے۔ صرف ایک سو مجاہدین ان کے ساتھ رہ گئے۔ رنجیت سنگھ نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور جرنیل شیر سنگھ کو بیس ہزار فوج دیکر بھیجا جس نے بالاکوٹ کے مقام پر دونوں غازیوں کو گھیر لیا۔ اس کی خواہش انہیں زندہ گرفتار کرنے کی تھی۔ مگر وہ غیرت کے پتلے یہ ذلت کب گوارا کر سکتے تھے اپنی مٹھی بھر فوج کے ساتھ میدانِ جنگ میں بڑی بہادری سے لڑے اور سینکڑوں دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار کر مردوں کی طرح شہید ہو گئے۔ یہ دردناک واقعہ ذیقعد ۱۲۴۶ھ کو پیش آیا۔

ان کی شہادت ایک سبق ہے۔ ہماری موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لئے کہ انہیں اسلام کی حفاظت اور عظمتِ ملی کی نگہداشت کس طرح کرنی چاہیئے۔

۱

موت پر فتح

جن دنوں حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل اور حضرت مولانا سید احمد سرحد میں سکھوں کے ساتھ مصروفِ جہاد تھے۔ تو بعض بندگانِ خدا خفیہ طور پر روپیہ جمع کر کے بھیجتے تھے۔ انگریزوں نے ان کی ٹوہ لگانے کے لئے خفیہ پولیس کے تجربہ کار آدمی مقرر کر رکھے تھے۔ مجاہدین کی امداد کرنے والے ایک مولوی صاحب بھی۔ جو ضلع فیروزپور کے باشندے تھے۔ سی۔ آئی۔ ڈی ان کے پیچھے لگی رہتی تھی۔ لیکن وہ نہایت ہوشیاری سے ان کے ہاتھ نہ آتے تھے۔ پولیس نے ہر چند کوشش کی مگر انہیں گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔

بدقسمتی سے ایک دفعہ وہ اپنے گھر میں اپنے اعزہ کو صرف چند گھنٹے کے لئے ملنے آئے۔ رات کا وقت تھا۔ کسی جاسوس نے ضلع

کے افسرانِ اعلیٰ کو خبر کر دی۔ کہ آج مولوی صاحب گھر پر موجود ہیں۔ اور ایک کثیر رقم سرحدی مجاہدین کو روانہ کرنے والے ہیں۔ اس وقت ان کی گرفتاری کا بہترین موقعہ ہے۔ قبل اس کے پولیس کی مسلح گارد مولوی صاحب کے مکان کا محاصرہ کر کے ان کو گرفتار کرتی۔ ایک ہندو سپاہی جو مولوی صاحب کا کسی زمانہ میں شاگرد رہ چکا تھا۔ یہ سنکر فوراً ان کے مکان پر پہنچا۔ تاکہ انہیں خبر کر دے کہ وہ بعجلت تمام روپوش ہو جائیں۔ رات کا وقت تھا اور مولوی صاحب مکان کی سہ منزلہ چھت پر معہ اپنے اعزہ کے سوئے ہوئے تھے۔ اس نے مولوی صاحب کو آوازیں دینی شروع کیں۔ لیکن افسوس کہ مولوی صاحب اور ان کے اعزہ میں سے کوئی بھی اس مسلسل پکار کو نہ سن سکا۔ وہ شخص مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد فوراً پولیس کا دستہ آپہنچا۔ اور مکان کا محاصرہ کر کے مولوی صاحب کو گرفتار کر لیا۔ اور لاہور بھیج دیا گیا۔

مقدمہ کی سماعت کے لیئے ایک خاص جج مقرر کیا گیا اور اُس نے مولوی صاحب کو سزائے موت کا حکم دیا۔ فیصلہ میں یہ بھی لکھ دیا۔ کہ ایک ہفتہ کے بعد اُن کو تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے۔ یہ حکم ہونے پر ڈاکٹر نے حسبِ معمول ان کا وزن کیا۔ لیکن جب آخری

روز تولا۔ تو پہلے روز کی نسبت وزن بیس سیر زائد نکلا۔ ڈاکٹر کو اس پر نہایت تعجب ہوا۔

جب مولوی صاحب کو کوٹھڑی سے نکال کر۔ پھانسی کے تختہ پر کھڑا کر دیا گیا۔ اتنے میں فیصلہ کنندہ جج جہانگیر تھا۔ پھانسی کا حکم اپنے سامنے دینے کے لئے وہاں پہنچا۔

ڈاکٹر نے جج کو بتایا کہ مولوی صاحب کا وزن پہلے وزن سے بقدر ۲ سیر بڑھ چکا ہے۔ اس میں کسی قسم کا خوف و اضطراب نہیں پایا جاتا۔ جج یہ سن کر نہایت حیران ہوا۔

اُدھر مولوی صاحب کی سنئے۔ کہ وہ بار بار بلند آواز سے کہہ رہے تھے کہ "جلدی کرو۔ فرشتے میرے استقبال کے اعلیٰ ترین لباس لئے کھڑے ہیں۔ باغاتِ جنت میرے سامنے نظر آ رہے ہیں۔"

جج مولوی صاحب کے پاس آیا۔ اور دریافت کیا۔ کہ "مولوی صاحب کیا وجہ ہے کہ آپ کا وزن بڑھ گیا ہے۔ حالانکہ پھانسی پانے والے مجرموں کا وزن آدھے سے بھی کم رہ جاتا ہے۔

مولوی صاحب نے جواب دینے سے انکار کر دیا۔

جج پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ اس کے جسم پر کپکپی

طاری ہو گئی۔ اور جیل کے کارکنوں کو حکم دیا کہ مسلمانوں کے اس لاٹ پادری کو فوراً تختہ دار سے اُتار لو۔ اور تا حکم ثانی اسے کوٹھری میں بند رکھو۔

یہ حکم دے کر جج فوراً گورنر صاحب کے پاس پہنچا۔ اس کو تمام صورتِ حالات سے مطلع کیا اور کہا کہ:۔

"یہ شخص (مولوی صاحب) مسلمانوں کا لاٹ پادری معلوم ہوتا ہے۔ پھانسی کے وقت بھی خوش و خرم ہے اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی جاذبیت برس رہی ہے۔ اور وہ اصرار سے بار بار کہتا ہے کہ کافرو مجھے جلد بندِ حیات سے آزاد کرو۔ اور میں تمہاری ملعون حکومت میں ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ رہنے کے لئے تیار نہیں۔ یور آنر! مجھے ڈر ہے کہ اگر اس کو پھانسی دی گئی تو کہیں اس کی موت انگریزی حکومت کے لئے موت کا باعث نہ بن جائے۔ لہذا یور آنر! اپنے خاص حکم سے اس کی پھانسی کی سزا کو عبورِ دریائے شور کی سزا میں تبدیل کر دیں۔ تاکہ ہماری حکومت کو مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

چنانچہ لاٹ صاحب نے اپنے مشیروں کے مشورہ سے کسی مصلحت کے پیشِ نظر مولوی صاحب کی پھانسی کے حکم کو عبور دریائے شور کی سزا میں تبدیل کر دیا۔

مولوی صاحب کو کالے پانی بھیج دیا گیا۔ وہاں جا کر انہوں نے شادی کر لی۔ ان کے چار پانچ بچے پیدا ہوئے۔ اور جب اپنے وطن میں واپس آئے تو تنہا نہیں تھے۔ ان کی رفیقۂ حیات اور بچے بھی ساتھ تھے۔ سب سے بڑھ کر بات یہ کہ دس ہزار روپیہ بھی ان کے پاس موجود اور وطن آنے کے بعد مزید تین چار سال تک زندہ رہے۔

ٹیپو سلطان

سلطنت میسور کا شیر دل حکمران حیدر علی جب ۱۷۸۲ء میں اس دنیا سے چل بسا۔ تو اس کے لائق بہادر فرزند ٹیپو سلطان نے زمام سلطنت ہاتھ میں لی۔ انگریزوں سے جو ہندوستان کو اپنی چالبازیوں سے رفتہ رفتہ غصب کر رہے تھے اور ان کے حلیفوں سے بدلہ لینے پر آمادہ ہو گیا۔

ٹیپو سلطان بیدنور کے مقام پر انگریزوں سے نبرد آزما ہوا۔ نہایت بے جگری سے جنگ کی لیکن انگریزوں نے صلح کر لی۔ مگر صلح ہو جانے پر بھی سلطان اور انگریز ایک دوسرے سے بدظن رہے۔ ٹیپو سلطان ٹرکی اور فرانس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور انگریز مرہٹوں اور نظام کو ساتھ ملا کر ٹیپو سلطان

کی سرکوبی کی فکر میں تھے ۔ آخر انگریز اپنی چال میں کامیاب ہوئے۔ اور جنگ وجدل کے بعد اس کا بہت سا علاقہ فتح کر لیا۔ باہمی ایک عہد نامہ ہوا۔ ٹیپو سلطان کو اپنا بہت سا علاقہ اور روپیہ دینا پڑا۔ کچھ حصہ مرہٹوں کو انعام میں ملا۔ اور کچھ حصہ ریاست میسور کا نظام نے غداری کے صلے میں حاصل کیا۔ ٹیپو سلطان نے بحالت مجبوری یہ نقصان برداشت تو کر لیا۔ لیکن ایک غیر ملکی اقتدار، مرہٹوں کی بدعہدی اور نظام کی غداری اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ ہر وقت انتقام لینے کے لئے بیقرار تھا اور ہندوستان کو غیر ملکی لیٹروں سے پاک صاف کرنے کا عہد کر چکا تھا۔ اس نے شہنشاہِ فرانس نپولین بوناپارٹ سے امداد طلب کی۔ وہ اپنا بحری بیڑہ لے کر آیا۔ مگر انگریز امیر البحر نے اسے راستے میں روک لیا۔ جب انگریزوں کو پتہ لگا۔ تو انہوں نے ٹیپو سلطان پر حملہ کر دیا۔ اور لڑائی شروع ہو گئی۔

سلطان کا بندہ دیوان انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ اور اس نے قلعہ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ سلطان موقعہ پر پہنچا۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر بازار میں پھینکوا دیا۔ مگر وہ نمک حرام اپنا کام کر چکا تھا تاہم لڑائی مختلف محاذوں پر جاری رہی۔

ایک دن سلطان ٹیپو دستر خوان پر بیٹھا ہی تھا۔ اطلاع ملی کہ

شہر پناہ کا ایک حصہ گرا دیا گیا ہے۔ سلطان نے ایک لقمہ اٹھایا۔ اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ قرآن شریف گلے میں حمائل کر کے قلعہ کے چور دروازے سے رخنہ دیکھنے لگا۔ رخنہ کے بند کرنے کے احکام دے کر لوٹا۔ تو دروازہ بند پایا۔ کھلوانا چاہا۔ مگر پاسبان نے نہ کھولا۔ سمجھ گیا کہ پاسبان بھی سازش میں شریک ہیں۔ فوراً پلٹا اور لڑنے والے سپاہیوں کی قطار میں کھڑا ہوا۔ اس وقت ایک نمک حرام رشتہ دار نے اطاعت قبول کر لینے کا مشورہ دیا۔ مگر سلطان نے نہایت حقارت سے منہ پھیر لیا۔ اور کہا کہ

"شیر کی ایک لمحہ کی زندگی کے ساتھ بھیڑ کی دو سو برس کی زندگی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ شہادت کا وقت آ چکا ہے۔ اب اس سے جان بچانا مردِ مومن کا کام نہیں۔"

سپاہی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ اور باآوازِ بلند کہا:۔

"جس کو جان پیاری ہے، وہ جا سکتا ہے۔ اس پر کوئی الزام نہیں۔ لیکن جسے شہید ہونے کی سعادت منظور ہے۔ وہ میرے ساتھ رہے اور دیکھے۔ کہ اللہ کی راہ میں جواں مرد کس طرح جان دیتے ہیں۔"

جانباز سپاہی سب گرد جمع ہوگئے۔ اتنے میں فوج قلعہ میں داخل ہوگئی اور لوٹ مار کرنے لگی۔ بہادر ساتھی قتل ہوگئے تھے۔ اور سلطان سخت زخمی ہوکر گر پڑا تھا۔ ابھی اس میں کچھ جان تھی کہ ایک گورا پاس سے گذرا۔ اس نے اس کے زریں پٹکے کی طرف ہاتھ بڑھایا سلطان نے نیم جانی کی حالت میں تلوار کا ایک ایسا ہاتھ مارا۔ کہ وہ کمبخت وہیں ڈھیر ہوگیا۔ تلوار کے اس آخری وار کے ساتھ ٹیپو سلطان کی آواز جو میدانِ جنگ میں گونجی وہ یہ تھی۔

"او کتے! زخمی شیر پر منہ مارتا ہے"

انگریز اپنی فتح یابی پر پھولے نہیں سماتے تھے۔ اور غدار نمک حرام انعام واکرام کی ہوس میں آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ دوسرے دن انگریزوں نے سلطان شہید کی لاش تلاش کی۔ لاش کو قلعہ میں پہنچایا۔ غسل دیا۔ جنازہ صحن میں رکھوا دیا۔ اور حیدر علی کے مقبرہ میں اسے سپردِ خاک کیا۔

سلطان ٹیپو کی وصیّت

تو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آبِ سیل سے بڑھ کے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیِ محفل نہ کر قبول

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرائیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

(اقبال)

سلطنتِ اسلامی کا آخری تاجدار

بہادر شاہ ظفر

بادشاہ کی جان عجیب کشمکش میں ہے۔ باغیوں کا مطالبہ۔ کہ وہ اُن کی سرپرستی فرمائیں۔ انگریزوں کی خواہش کہ ان کی اطاعت قبول کریں "جانِ مجنوں کے لئے دوگونہ عذاب" ۔ دونوں کو خوش تو کر نہیں سکتے آزادی کا خیال اور ضمیر کی آواز یہی ہے ۔ انگریزوں کا خاتمہ کیا جائے مگر طاقت نہیں۔ اقتدار نہیں۔ کوئی بس نہیں چلتا۔ باغیوں کے سردار بخت خاں نے بہت سے پیغامات بھیجے ہیں کہ آپ کوئی فکر نہ کریں ہم آپ کا بال بیکا نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن انگریزوں کا پلہ بھاری ہے اور بادشاہ کے مصاحبِ خاص جاسوس بنے ہوئے ہیں۔ پل پل کی خبر انگریزوں کو پہنچاتے ہیں۔

بادشاہ بیگم زینت محل اور فرزند دلبند مرزا جواں بخت پاس بیٹھے ہیں۔ اُن کے چہرے زرد۔ آنکھیں غمناک اور لبوں پر سرد آہیں

زینت محل۔ باغی راستی پر ہیں۔ اپنے ملک کے بچاؤ کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

جواں بخت۔ انگریز خواہ مخواہ آکر ہمارے سر چڑھ گئے۔ ان کا حق ہی کیا ہے جو اس طرح ہمارے ملک و مال پر قبضہ کریں۔

بہادر شاہ۔ اب حق کو کون پوچھتا ہے۔ اور کسی کی داد رسی کون کرتا ہے۔ ہماری کمزوریوں نے یہ دن دکھائے۔ ورنہ ہزاروں میل سے آکر صدیوں کے مالکوں کو بے دست و پا کر دینا کس کی جرأت ہو سکتی ہے۔ آہ! ے

خواب تھا جو زندگی جاہ و حشم میں کٹ گئی
ورنہ ساری عمر اپنی درد و غم میں کٹ گئی

یہ بادشاہی میرے لئے وبالِ جان ہوگئی۔ ایک مصیبت ٹلنے نہیں پاتی۔ کہ دوسری آموجود ہوتی ہے۔ باغی قلعہ میں داخل ہوگئے ہیں۔ باہر انگریزوں کی فوجیں ہیں۔

جوان بخت۔ بخت خاں نے جو کہلا بھیجا ہے۔ کہ ہم انگریزوں سے نپٹ لیں گے۔ آپ مقبرہ ہمایوں میں چلے جائیں،،

بہادر شاہ ۔ مصلحت تو یہی ہے ۔ کہ وہاں جاکر اپنی آزادی کی سبیل پیدا کریں ۔

بہادر شاہ ۔ اس کی بیگمات اور لڑکے راتوں رات مقبرہ ہمایوں میں چلے گئے ۔ اِدھر احسن اللہ خاں ۔ رجب علی خاں اور الٰہی بخش نمک حرامی پر تلے ہوئے اور سائے کی طرح بادشاہ کے پیچھے لگے رہتے ہیں ۔ اُن میں سے کوئی نہ کوئی موجود رہتا ہے ۔ بلکہ بادشاہ کے ہر کام میں خواہ مخواہ شریک ہو جاتے ہیں ۔ اتنے میں الٰہی بخش آتا ہے اور بادشاہ کو تسلی دیتا ہے کہ کوئی فکر نہ کریں ۔ ہم بدستور آپ کے ساتھ ہیں ۔ انگریز آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے ۔ آپ بدستور آرام سے حکومت کریں ۔ قلعہ پر آپ کا ہی قبضہ ہے ۔

بہادر شاہ :۔ اچھا! تو انگریز چلے جائیں گے ۔ ہماری فوجیں انہیں بھگا دیں گی ۔ اگر یہ صورت ہو ۔ تو میں خود تلوار لے کر میدان میں نکلنے کے لئے تیار ہوں ۔ آہ! انگریز! ۔ انگریز ——— بڑے چالاک ۔ عیار اور ظالم ہیں (حواس باختہ ہو کر) نکال دو اُن کو ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں ۔ بخت خاں پھر نہیں آیا ۔ وہ بھی کسی فکر میں ہوگا ۔

الٰہی بخش :۔ کیوں نہیں ؟ اس نے تمام شہر میں قتلِ عام کر رکھا ہے۔ کوئی انگریز اس کے ہاتھوں زندہ نہیں بچتا۔ قلعہ میں چند پناہ گیر آئے تھے۔ وہ بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ عورتیں اور بچے بھی۔

بہادر شاہ :۔ یہ اچھا نہیں کیا۔

الٰہی بخش :۔ انگریزوں نے بھی تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

بہادر شاہ :۔ اچھا! تم یہیں رہو۔

بہادر شاہ (آنسو بہا کر) قلعہ سے نکلے۔ یہاں آئے۔ اب کہاں جائیں گے۔؎

چھوٹا بھی قفس سے تو کہاں طاقتِ پرواز
مجھ کو ہے بڑا اپنی رہائی کا غم و رنج
ہر دم ظفرؔ اک تیغِ الم کھینچ کے دل پہ
کیا ہاتھ لگاتے ہیں صفائی کا غم و رنج

میں ملک کا مالک ! خانہ بدوش بے سر و سامان۔ بے یار و مددگار۔ اور اجنبی ڈاکو۔ چور یہاں کے مالک۔ یہاں کی حقیقی رعایا باغی ——— اور میں ان کا سرپرست ! ——— یا الٰہی ——— یہ بھی انقلاب دیکھنا تھا۔ میرے دادا ہمایوں نے انقلاب دیکھا۔ مگر پھر اس کا

ستارہ چمکا، تاریکی دور ہوئی۔ اور اس کی حکومت بحال ہو گئی ——
لیکن اب مشکل ہے۔ کوئی خیر خواہ نہیں۔ دشمنوں کے نرغے میں
ہوں۔ نہ فوج ہے نہ سپاہ۔

ابھی منہ اندھیرا تھا۔ آسمان کے ستارے ظفر کی اضطراب انگیز
حالت دیکھ دیکھ کر تڑپ رہے تھے۔ چاند مارے غم کے آدھا رہ
گیا۔ نسیم سحر کے تیز جھونکے اس عظمت و جلال کی شمع سوزاں کو
کچوکے دے رہے تھے۔ مقبرہ ہمایوں میں بالکل سکوت اور خاموشی
کا عالم تھا۔

اچانک مسٹر ہیوڈسن (حاکم دہلی) ایک فوجی دستے کے ساتھ
نمودار ہوا۔ اور سپاہیوں کو حکم دیا۔ مقبرہ کا محاصرہ کر لو۔ کہیں بادشاہ
فرار نہ ہو جائے۔

فوجی افسر:۔ بہت اچھا۔ سپاہی مقبرے کے چاروں طرف
پھیل گئے۔

ہیوڈسن:۔ کوئی سپاہی اندر جائے۔ اور بادشاہ کو باہر آنے
کا پیغام پہنچائے۔

الٰہی بخش اندر سے آیا۔ اور سلام کر کے کہا۔ کیا ارشاد ہے؟

فوجی افسر۔ بادشاہ اندر ہے۔

الٰہی بخش۔ جناب۔ میں تو اسی واسطے رات یہاں رہا۔

ہیوڈسن۔ بادشاہ کو ہماری طرف سے پیغام پہنچاؤ کہ فوراً باہر آؤ۔

الٰہی بخش نے پیغام دیا۔ اس فرعونی حکم سے سب مظلوموں کے دل پر بجلی گر گئی۔ بادشاہ الگ رو رہا ہے۔ بیگمات علیحدہ فریاد و فغاں کر رہی ہیں۔ اور بیٹے جدا اپنی سیہ بختی پر اشک حسرت بہا رہے ہیں

الٰہی بخش نے واپس آکر کہا۔ حضور تیاری ہو رہی ہے۔"

ہیوڈسن۔ ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ جاؤ۔ انہیں کہو۔ دیر نہ کرو۔ فوراً باہر آؤ۔

فوجی افسر۔ سنا ہے۔ بخت خاں بھی اُن کے ساتھ ہے۔ بادشاہ کو بھگا لے جانے کی سازش میں شریک ہے۔

ہیوڈسن۔ اگر ہو۔ تو اُسے بھی گرفتار کرو —— بہت دیر ہو گئی۔ کیا بھاگنے کے منصوبے سوچے جا رہے ہیں۔

فوجی افسر۔ (دیکھ کر) نہیں! وہ آرہے ہیں۔

(بہادر شاہ معہ زینت محل۔ جواں بخت وغیرہ کے آیا)

بہادر شاہ:۔ کیا آپ گرفتار کرنے کی غرض سے ہیں؟

ہیوڈسن۔ ہاں! اسی لئے۔

بہادر شاہ:۔ میرا قصور؟۔

ہیوڈسن:۔ سازش کا فتور!

بہادر شاہ:۔ مجھ پہ الزام؟

ہیوڈسن:۔ انگریزوں کا قتلِ عام

بہادر شاہ:۔ میں بے گناہ ہوں۔ سازش میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور نہ انگریزوں کے قتل میں کوئی مشورہ دیا۔

ہیوڈسن:۔ یہ تحقیقات پر معلوم ہو جائے گا ——— ہتھیار رکھ دیجئے۔

بہادر شاہ (دم سرد بھر کر)

بروزِ حشر دکھا دے گا یہ دلِ مضطر
خدا کے سامنے تیرے اسیر کا محضر

یہ کہہ کر ہتھیار دے دیئے۔ اور ہیوڈسن نے حراست میں لئے۔

بادشاہ۔ زینت محل بیگم اور جواں بخت کے چلے جانے کے بعد۔ مخبر نے خبر دی۔ کہ مرزا مغل۔ قیصر سلطان اور مرزا ابوبکر مقبرے میں چھپے ہوئے ہیں۔ مقبرے پر پھر پہرہ لگا دیا گیا۔ اور بہادر شاہ

کو ایک مقام پر نظر بند کر کے ہیوڈسن مع فوج کے واپس آیا۔ بہادر شاہ کے دو بیٹوں اور ایک پوتے کو گرفتار کیا۔ اور ایک بہلی میں بٹھا کر حراست میں لے چلا۔ مصیبت زدہ شہزادے ظالموں کے جلوس میں جا رہے تھے۔ اُن کو موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ مگر وہ خاموش آنے والی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ ملک و مال سے محرومی۔ والدین کی جدائی کا درد۔ مجرمانہ اسیری کا رنج۔ ان پیہم صدمات نے اُن کے دل پتھر کر دیئے تھے۔ آنکھیں بے نم اور لب خشک اور نہایت یاس و حسرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

جب میل ڈیڑھ کے فاصلے پر ایک میدان میں بے گناہ مجرموں کی سواری پہنچی تو ٹھہرنے کا حکم ہوا۔

ہیوڈسن نے کہا۔ اِن کو نیچے اُتارو اور کپڑے اُتروا دو۔

معصوم شہزادے سراسیمہ و حیران نیچے اُترے۔

اُن کے کپڑے اُتروا دیئے گئے ——— سامنے بندوقیں تنی ہیں۔ خاموش ہیں اور شانِ خداوندی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

اِرد گرد کے درخت دشمنوں کی قہر آلود نظروں کو دیکھ کر کانپ رہے ہیں۔ آندھیاں آئیں اور چلی گئیں۔ بگولے اُٹھے اور

ہوا ہو گئے۔ آفتاب نے سیاہ بادلوں میں اپنا منہ چھپالیا۔

شہزادے بُت بنے کھڑے ہیں۔ کہ بندوقوں کی ایک ہی باڑ سے۔ اس خشک میدان میں —— نازپروردہ شہزادوں کی لاشیں بے آب مچھلیوں کی طرح تڑپیں اور ٹھنڈی ہو گئیں۔

ابھی ظالموں کے دل میں انتقام کی آگ موجود تھی۔ اس پر بس نہیں کی۔ شہیدانِ جفا کی لاشوں کو کوتوالی کے دروازے میں لٹکا دیا۔ برابر تین چار دن لٹکی رہیں۔ کیوں؟

اس خطا پر انہیں مارا کہ گنہگار نہ تھے

ہندوستان کا بادشاہ —— ۹ مارچ ۱۸۵۸ء کو ——

مہذب ڈاکوؤں اور سیاسی چوروں کی ایک عدالت (کمیشن) کے روبرو لایا گیا۔ در و دیوار لرز گئے جس کے دل میں انسانیت کا ایک شمہ بھی تھا۔ دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ ایک خود ساختہ ایکٹ (۱۶ ۱۸۵۷ء) کے رُو سے چار الزام قائم کئے گئے۔

حکیم احسن اللہ۔ مرزا الٰہی بخش۔ منشی رجب علی گواہ پیش ہوئے۔

استادانِ اجل نے جو پڑھایا تھا۔ کہہ دیا۔

بادشاہ مجرم قرار پایا۔ سزا کیا؟ جلاوطنی اور رنگون میں نظر بندی

حسرت ناک روانگی

روانگی کا وقت آیا اگرچہ یہ خبر نہایت پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ مگر ارادتمند پھر بھی جوق در جوق جمع ہو گئے۔ کہ اپنے بادشاہ کی آخری زیارت کر لیں۔

بادشاہ، اپنی دو بیویوں زینت محل، تاج محل اور دو بیٹوں جواں بخت و عباس شاہ کے ساتھ ڈولی میں سوار ہے۔ گوروں کا پہرہ۔ بادشاہ ڈولی کے پردے اٹھا دیتا ہے۔ ہاتھ آسمان کی طرف ہیں ستم دیدہ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہے۔ خاموش صدائیں الوداع کہتی ہیں۔ اور آہ و بکا کے شور میں سواری گذر جاتی ہے :

جب چراغِ گل چمن میں یک بیک گل ہو گیا
چشمِ بلبل میں جہاں تاریک بالکل ہو گیا
ہو گیا پھیکا ترے جانے سے رنگِ روئے گل
بے نمک نالوں سے میرے شورِ بلبل ہو گیا (ظفر)

ایک معمولی خستہ و خراب کمرے میں بادشاہ بسترِ مرگ پر پڑا ہے زینت محل اور دونوں بیٹے پاس بیٹھے آنسو بہا رہے ہیں۔

زینت محل :- ہمارے اقبال کا دن تو دیر سے ڈھل چکا تھا مگر اب امیدوں کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہونے والا ہے جس کا مشرق شاہ جہان آباد کا قلعۂ معلیٰ تھا۔ اس کا مغرب رنگون کی تیرہ و تاریک کوٹھڑی ہے جس کا طلوع خوشی کے شادیانوں کے ساتھ ہوا تھا وہ درد و الم کی دل شکن آہوں کے شور میں غروب ہو رہا ہے۔ آہ ؎

آگئی سر پہ شب حسرت کی شام میری آنکھوں میں جہاں تاریک ہے

بہادر شاہ (ایک آہ سرد بھر کر) روز روشن ختم ہو چکا۔ اجالا رفتہ رفتہ دور ہو رہا ہے۔ میری آنکھیں بے نور ہو رہی ہیں۔ اب رخصت کا وقت آگیا۔ دنیا کی حسرتو! میرے دل سے نکل جاؤ۔ بیتاب رکھنے والے ارمانو! جاؤ جاؤ مجھے نہ ستاؤ۔ میں مظلوم ہوں بے گناہ ہوں۔ میں نے آباو اجداد کی سلطنت کو بچانے کی کوشش کی۔ مظلوم رعایا کو غیروں کے ظلم و تشدد سے بچانا چاہا۔ میرے اشارہ پر کسی بے گناہ کو ضرر نہیں پہنچا۔ مگر — اب ان باتوں کو یاد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ؎

ہمارا اور عالم ہم کو اس عالم سے کیا مطلب
کسی سے کیا غرض ہم کو کسی کو ہم سے کیا مطلب
میرے زخموں میں کچھ نمک اور مرچیں کوٹ کر بھر دو
کہ یہ ہیں زخم عاشق کے انہیں مرہم سے کیا مطلب

جو یہ سمجھے۔ کہ ملتا ہے وہی جو ہے مقدر میں
رہا اُن کو ظفرؔ پھر فکر بیش وکم سے کیا مطلب

اُٹھو اُٹھو! شمع جلاؤ۔ کہ میری عمر کا چراغ گُل ہو رہا ہے۔ جاگو جاگو۔ کہ بد نصیب ظفرؔ موت کی گہری نیند میں سو رہا ہے ——— آہ! گردشِ تقدیر نے کہاں لاکر پھینکا کہ دہلی کی خاکِ پاک میں دو گز جگہ بھی نہ پائی آہ! بزرگوں کے پہلو میں سونے کی سعادت بھی نصیب نہ ہوئی۔ قیدِ حیات میں وہ صدمے اُٹھائے۔ کہ اُن کی یاد سے روح کانپ رہی ہے ؎

خدا جانے ظفرؔ ملکِ عدم کے رہنے والوں کی
فراغی سے گزرتی ہے کہ تنگی سے گزرتی ہے

نہیں نہیں ——— عدم کی ——— زندگی ——— یہاں کی ——— زندگی ——— سے ——— بہر حال ——— خوش ——— گوار ہوگی ——— فنا کی ——— تار ——— یکی ——— میں ——— امن ——— و ——— سکو ——— ن ——— کی ——— شم ——— ع ——— رو ——— شن ——— ہوگی ——— خدا ——— حافظ ——— الوداع

(روح پرواز کر جاتی ہے)

مصر کا پہلا عوامی لیڈر

مصر انگریزوں کے پنجۂ حرص و آز میں دم توڑ رہا تھا۔ نیل کی زرخیز زمین پر ان سفید ڈاکوؤں کا قبضہ تھا۔ اگرچہ بظاہر مصریوں کی حکومت تھی۔ خدیو اس کا بادشاہ ہوتا تھا مگر اپنے دجل و فریب اور مصر کے کمزور اور خود غرض وزرار کی وساطت سے کچھ ایسے معاہدے کئے۔ جن کی وجہ سے غلامی کی زنجیریں روز بروز مضبوط ہو رہی تھیں۔ اگر کوئی کڑی کمزور ہو جاتی۔ تو اس کی جگہ اس سے مضبوط تر ڈال دی جاتی۔ یہ صورت مخلص اور حقیقت شناس فرزندانِ ملک کے لئے نہایت اذیت رساں تھی۔

آخر قدرت نے ایک نوجوان (جس کی پیدائش ۱۸۷۴ء تھی) مصطفےٰ کامل کے دل میں آزادی کا زبردست احساس پیدا کیا۔

اُس نے علم حاصل کیا۔ قانون میں مہارت حاصل کی۔ پیرس میں تعلیم پائی اور سیاسیات کا وسیع مطالعہ کیا۔

وہ نہایت ہوشمند اور دقیقہ رس تھا۔ اس نے تحریر و تقریر اور میل جول کے ذریعے آزادی کی مہم شروع کر دی۔ اور اکثر علم دوست اور محبِ وطن نوجوان اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس کی مساعی کی خاموش آگ انگریزی اقتدار کے دھوئیں بکھیر رہی تھی۔

۱۸۹۳ء میں جبکہ مصطفےٰ کامل کی عمر صرف ۱۹ برس کی تھی۔ پہلی مرتبہ مصری حکومت کی کوتاہیوں اور بدعملیوں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے انگریزوں سے مصر خالی کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ انگریزی سیاست کے لئے برقِ خرمن سوز تصور کیا گیا۔ انگلستان کے سیاسی حلقے متزلزل ہو گئے۔

۱۸۹۴ء میں فرانس جا کر سیاست دانوں اور صحافیوں سے ملاقات کی۔ وہاں چندے قیام کیا۔ اور مصری آزادی کی تبلیغ میں شب و روز مصروف رہا۔ پیرس یونیورسٹی میں مقیم مصری طلبا کے ایک اجتماع میں مصطفےٰ کامل نے دل کھول کر آزادیٔ مصر کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اور پھر ایک مرتبہ اس مطالبہ کو دہرایا۔ کہ انگریز مصر کو خالی کر دیں۔

اہل فرانس کو مصری مطالبہ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ محض بغض انگریز کی وجہ سے مصطفٰے کامل کی طرفداری کر رہے تھے۔

مصطفٰے کامل کو سفر فرانس میں یہ فائدہ ضرور ہوا۔ کہ مہذب دنیا کے سیاستین کی توجہ اس طرف مبذول ہوگئی۔ اور آزادی مصر کا مسئلہ بین الاقوامی صورت اختیار کرنے لگا۔ احرار مصر کی آواز فرانسی اخبارات کے ذریعے یورپ اور امریکہ کے کانوں تک پہنچ گئی۔ انگلستان کے مدبروں کو بھی ہوش آیا۔ اور گلڈسٹون (وزیر اعظم) جیسے لوگ بھی مصر کے مطالبہ آزادی اور اخراج انگریز کو درست سمجھنے لگے۔ اور انہیں اس کی صداقت کا علانیہ اقرار کرنا پڑا۔

مصطفٰے کامل نے اپنا کاروبار (پیشہ وکالت) بالکل چھوڑ دیا۔ محبت وطن اور آزادئ قوم کے جذبہ نے اختیار نے اپنے آرام و راحت مفاد و اغراض سے بالکل بے نیاز کر دیا۔ اپنی آواز کو مضبوط کرنے اور مطالبۂ آزادی کو تقویت دینے کی غرض سے اپنا اخبار "اللواء" جاری کر دیا۔ جو عربی۔ فرانسیسی اور انگریزی میں شائع ہوتا تھا۔

جوں جوں مصطفٰے کامل کی تحریک زور پکڑتی گئی۔ انگریزی مدافعت بھی مضبوط ہونے لگی۔ لارڈ کرومر جو انگریزوں کا مختار کار مصر میں مقیم تھا۔ مصریوں میں نفاق پیدا کرنے اور انگریزوں کے قبضۂ مصر

کو جائز قرار دینے پر تُل گیا۔ لیکن اس کی مخالفت مصطفٰے کامل کو متزلزل نہ کر سکی۔

مصطفٰے کامل مصری آزادی کا واحد علمبردار تھا۔ اس کی بھڑکائی ہوئی آگ انگریزوں کے دلوں کو جلا رہی تھی اس کے شعلے انگریزی منصوبوں کے لئے برقِ خرمن سوز بن رہے تھے۔

مصطفٰے کامل مغربی لباس کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتا تھا۔ میانہ قد، مضبوط جسم، گندمی رنگ۔ لمبی لمبی مونچھیں۔ بڑا دلیر اور نڈر انسان تھا۔ خود اعتمادی کے ساتھ دیانتداری بدرجۂ غایت پائی جاتی تھی۔ بڑا تیز مزاج آدمی۔ ہر وقت سیماب کی طرح مضطرب و بیقرار۔ قوتِ بیان کے علاوہ حافظہ بھی بے نظیر پایا تھا۔ بڑا پاکباز اور نیک نیت انسان تھا۔ اس کا مطمحِ نظر ہمیشہ بلند رہا۔ آزادیٔ وطن کے مقابلے میں تمام دنیا اس کے لئے ہیچ تھی۔ آزادی کے انہماک نے اتنی فرصت بھی نہ دی۔ کہ وہ کوئی رفیقۂ حیات تلاش کر سکے۔ عمر بھر تنہا رہا۔

مصطفٰے کامل تقریر کرتا۔ تو ایسے معلوم ہوتا۔ کہ بجلی کڑک رہی ہے یا سیلاب کا پانی زور شور کے ساتھ بلندی سے پستی کی طرف جا رہا ہے وہ حاضرین پر اس طرح چھا جاتا۔ کہ بلا خوف و خطر ہزاروں آدمیوں کا ایک مرقع بن جاتا۔ اس کی زبان تلوار کی طرح چلتی اور لوگوں کے دلوں کو مسخر

کرتی چلی جاتی۔ گھنٹوں تقریر کرتا۔ مگر روانی اور لب و لہجہ میں کوئی فرق نہ آتا۔ بلکہ سلسلۂ کلام ہر لحظہ تیز اور انداز بیان دلنشیں ہوتا جاتا تھا۔ ایک تقریر جو اُس نے اپنی عمر کے آخری دَور میں کی۔ وہ بہت جامع بسیط اور تیز تھی۔ مصری حدود سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گئی۔

ہندوستان میں اس کا ترجمہ مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا چونکہ یہاں بھی انگریزی دخل و عمل تھا۔ اس لئے وہ تقریر بحق سرکار ضبط ہو گئی۔

وہ جانبانہ وطن اور سرفروشِ ملّت فرانس کی حریت پسندی سے متاثر ہو کر وطن کی آزادی کے لئے مسلسل تیرہ برس کوشاں رہا۔ اور اس عرصہ میں انفرادی جد و جہد سے وہ کچھ کر دکھایا کہ قومیں اور جماعتیں بھی اتنی قلیل مدّت میں اتنا عظیم الشان کام سر انجام نہ دے سکیں مصری نوجوانوں کے دلوں میں حبّ وطن اور آزادی مصر کی ایسی آگ سلگا دی جسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بجھا سکتی۔

وہ بہادر —— سعد زاغلول پاشا نحاس پاشا اور دوسرے فدا کارانِ وطن کے لئے راستہ صاف کر گیا۔ جو اُسی پر گامزن ہیں اور انگریزی قبضہ کو جو دم شماری کی حالت میں ہے۔ لندن کی راہ دکھا رہے ہیں۔ اور ببانگِ دہل کہہ رہے ہیں۔

"اپنی فوجیں مصر سے نکالو۔ اور سوڈان ہمیں دو۔"

افسوس! یہ شیر دل بہادر۔ مخلص جانباز مصر۔ اور شمع آزادی کا پروانہ صرف ۳۲ برس کی عمر میں ۱۰ فروری ۱۹۰۸ء کو آزاد دنیا کی طرف روانہ ہو گیا۔

اگرچہ وہ کچھ عرصہ علیل رہا۔ مگر اُس وقت عام خیال تھا کہ مصطفےٰ کامل کی موت طبعی موت نہ تھی۔ بلکہ اس میں بھی دشمنوں کی سفیہانہ سازش تھی۔

موت کی خبر آنِ واحد میں اطراف و جوانب میں پھیل گئی بس پھر کیا تھا۔ ملک بھر میں صفِ ماتم بچھ گئی ہر شخص مغموم اور بادیدۂ پُرآب نظر آتا تھا۔ ہزاروں انسان اظہارِ رنج و غم کے لئے آ گئے۔ جنازہ کا جلوس ایک میل لمبا تھا۔ قبرستان سے گھر تک لوگوں کا ہجوم تھا۔ مصر میں اس سے پہلے ایسا ماتمی جلوس نہیں دیکھا گیا تھا

وہ نہایت شریف۔ مخلص۔ نیک دل اور بے لوث تھا۔ جب اس مردِ حق نے آخرت کے لئے رختِ سفر باندھا۔ تو گھر میں اتنی رقم بھی نہ تھی کہ کفن خریدا جا سکے۔ یہ ہے خدمتِ وطن اور حقیقی ایثار۔ ع "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

شیخ جمال الدین افغانی

شیخ جمال الدین ایک عالم اجل، پیکرِ حریت اور اولو العزم انسان تھے۔ وہ مطلق العنانی طرزِ حکومت۔ شاہانہ جلال، اور امیرانہ نمود و نمائش کے سخت مخالف تھے۔ ۱۸۳۹ء میں افغانستان کے مشہور شہر کونان میں پیدا ہوئے۔ علم حاصل کیا جب جوان ہوئے۔ افغانستان کی خانہ جنگی سے تنگ آ کر ہندوستان کے راستے مصر کو چلے گئے۔ وہاں انگریزی غلبہ کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا اور لوگوں میں انگریزوں کی گندم نمائی جو فروشی کے حالات طشت از بام کر دیئے۔ انگریزوں کے اس غلبہ و اثر کو دیکھ کر وہ قسطنطنیہ چلے گئے۔

قسطنطنیہ میں انہوں نے اپنے خیالات کی اشاعت شروع

کی۔ وہ زبردست عالم تھے۔ کوئی ان کے سامنے بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ شیخ الاسلام ان کے خلاف تھے۔ ملّا لوگ ان سے جی چراتے تھے۔ آخر انہوں نے فتویٰ لگا کر انہیں قسطنطنیہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

قسطنطنیہ سے آپ پھر مصر آئے۔ جہاں انہوں نے پھر انگریزی اثر و غلبہ کی مخالفت شروع۔ عوام کو اپنا ہم خیال بنایا۔ اور بتایا کہ "انگریز کس طرح مددگار بن کر سامنے آتا ہے اور آخرکار آقا بن کر سر پر سوار ہو جاتا ہے"۔

شیخ جمال الدین نے انگریزی اثر کے خلاف ایک انجمن قائم کی۔ شیخ محمد عبدہٗ اور سعد زاغلول پاشا جیسے لوگ جس کے ممبر بنے اور انگریزی کارستانیوں کو بذریعہ تحریر و تقریر خوب واضح کیا۔ نوجوانوں کی کثیر تعداد ان کے ساتھ ہو گئی۔ مگر خدیو توفیق نے انگریزوں کے کہنے سننے سے شیخ کو جلاوطنی کا حکم دے دیا۔

مصر میں شیخ نے جو آگ بھڑکائی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ اس قدر بڑھی کہ اس کے شعلے انگریزی سیاست کو تباہ کرنے لگے۔ شیخ مصر سے حیدرآباد دکن پہنچے۔ انگریزوں نے شیخ کو حیدرآباد سے لاکر کلکتہ میں نظر بند کر دیا۔

کلکتہ میں کچھ دیر نظر بند رہنے کے بعد رہا کئے گئے۔ تو وہاں سے پیرس پہنچے۔ وہاں سے ایک اخبار جاری کیا۔ جس میں مصری سیاسیات پر زبردست تبصرے ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد مالی مشکلات کی وجہ سے اخبار بند ہو گیا۔ وہ نہایت غیور، صابر، اور قناعت پسند تھے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں جانتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب وہ مصر سے نکل کر یورپ جانے کے لئے سویز آئے۔ تو ان کے پاس سفر خرچ نہ تھا۔ ایرانی سفیر نے چاہا۔ کہ کچھ مدد کرے لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ کہ

"آپ اپنا روپیہ اپنے ہی پاس رکھیں۔ مجھ سے زیادہ آپ کو اس کی ضرورت ہے۔ شیر جہاں جائے گا۔ اپنی غذا ڈھونڈ لے گا۔"

مصر سے روس گئے۔ تاکہ وہاں زار روس سے مل کر ہندوستان کی آزادی کے لئے کوشش کریں۔ چنانچہ وہاں دو سال رہے اور اسلام کی بہت خدمت کی۔

روس میں شاہ ناصر الدین بادشاہ ایران سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ ایران آ گئے۔ چند روز ان کے ساتھ رہے۔ مگر اختلاف کی وجہ سے الگ ہو گئے اور ایرانی عوام میں انگریزوں اور شہنشاہیت

سے نفرت کی تبلیغ شروع کی۔ یہ حالات دیکھ کر شاہِ ایران نے انہیں ایران سے نکل جانے کا حکم دیا۔ ان کے بہت سے معتقد وہاں تھے انہوں نے ناصرالدین کو قتل کر کے شخصی حکومت کا خاتمہ کر دیا آپ ڈیڑھ سال ایران میں رہے۔

پھر سلطان عبدالحمید خاں نے قسطنطنیہ بلا لیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد ملک میں جمہوریت کی تبلیغ کرنے کی وجہ سے سلطان بھی مخالف ہوگیا۔ اور انہیں قید کر دیا۔ باقی عمر قید خانہ میں گذری۔ آخر یہ مجاہدِ اسلام و پیغمبرِ حریت ۱۸۹۷ء میں جیل خانہ میں فوت ہوگیا۔ اور قسطنطنیہ کے ایک قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

تقریباً پچاس سال کے بعد قسطنطنیہ سے ان کی لاش منگوا کر افغانستان میں سپردِ خاک کر دی گئی۔

شعرا و ادبا پر مظالم

حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت اسلامی زوال کی خوفناک منزل کی طرف بڑھنے لگی۔ خانہ جنگی نے اُن تمام طاقتوں کا خاتمہ کر دیا۔ جو کسی خاندان، کسی قوم یا کسی ملک کی حیات و بقا کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اٹھارھویں صدی ایک ہولناک انقلاب کا پیغام لائی۔ جسے ہماری رو بہ زوال حالت نے لبیک کہا۔ اور ہمارے مردانِ کار نے بسرعت تمام بربادی و تباہی کی طرف جانا شروع کیا۔ جنگِ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کے قدم مضبوطی کے ساتھ جم گئے۔ اور سارے ملک میں انھوں نے رفتہ رفتہ اپنا اقتدار قائم کر لیا ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی افواج شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ دلی تک آگئیں۔ اور شاہ عالم ثانی بالکل انگریزوں

کی ماتحتی میں آگیا۔

یہی وہ زمانہ تھا۔ جبکہ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی انقلاب انگیز تحریک شروع کی۔ یہ تحریک مذہبی بھی تھی۔ سیاسی بھی۔ معاشی بھی اور ادبی بھی۔ شاہ صاحب کا خیال تھا۔ کہ ہندو اور مسلمانوں کی کمزوری اور انحطاط کا باعث یہ ہے۔ کہ دونوں اس سچے مذہبی جذبہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ جو انسان کو انسان بنائے رکھتا ہے۔ اس جذبہ کو وہ خدا پرستی اور تربیتِ نفس کے ذریعے بروئے کار لانا چاہتے تھے۔ مگر افسوس! کہ بہت لوگوں نے اس پر توجہ نہ کی۔

شاہ صاحب نے قرآن شریف کا سب سے پہلا فارسی ترجمہ کیا جس سے حکومت کے ایوان میں ایک زلزلہ برپا ہو گیا۔ اور اس کی خود غرضانہ انگیخت سے جاہل عوام اور بزعم خود غلط مولوی ننگی تلواریں لے کر شاہ صاحب پر ٹوٹ پڑے۔ اُن کو اس سلسلہ میں وہی تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔ جو جان کلف اور اس کے ساتھیوں کو انجیل کا ترجمہ کرنے پر اٹھانا پڑی تھیں۔ انجامِ کار حکومت کے ایک آلۂ کار بدخواہِ ملت نجف خاں نے شاہ صاحب کے ہاتھ کٹوا دیئے تاکہ وہ بذریعہ تحریر اپنے خیالات کی اشاعت نہ کر سکیں۔ اور ان کے دونوں بیٹوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو ملک بدر

کر دیا۔

ایک ہندو مورخ رتن لال بنسل نے لکھا ہے کہ :-

"بدیشی قوموں کے بڑھتے ہوئے خوفناک پنجوں سے ہندوستان کو بچانے کے لئے شاہ ولی اللہ صاحب زندگی بھر لڑتے رہے اور اپنے وارثوں بیٹوں، رشتہ داروں اور ہزاروں شاگردوں کے دلوں میں ایسی آگ چھوڑ گئے۔ کہ انہوں نے مرجانا پسند کیا۔ مگر ہندوستان کی غلامی کو چپ چاپ برداشت نہیں کیا۔"

انگلستان کی سیاسی جدوجہد مذہبی نزاع سے شروع ہوئی تھی۔ ایسے ہی ہماری آزادی کا تخیل مذہبی چشمہ سے پھوٹا۔ اور اس کا ہر ایک قطرہ ایک برق آفریں آگ کا شعلہ تھا۔ جو جبر و استبداد کے بادلوں میں چشمک زنی کرتا رہا۔

غدر کا پُر آشوب زمانہ ساری تاریخ کا ایک نیا دور تھا۔ جو تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ مگر اس کا انجام آخر کار نوے سال کے بعد ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کی تخلیق کا موجب ہوا

شاہ ظفر اور اس کے فرزند

شاہ ظفر کا حسرت ناک انجام اس کے جان سے عزیز فرزندوں کی مظلومانہ موت اور محبانِ وطن کا قتلِ عام یہ ایسے لرزہ خیز واقعات ہیں۔ جو ایک علیحدہ کتاب کے محتاج ہیں۔ ہزاروں بہادر جنہوں نے انگریزوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا تھا۔ نہایت بے رحمی سے قتل کئے گئے۔ بیشمار آزادگانِ ملک سے باہر جانے پر مجبور ہوئے۔ آہ! ایک قیامت تھی جو ہندوستان کے قلب میں برپا تھی۔ بڑے بڑے صاحبِ اقتدار اور والیانِ ریاست اور ان کے خیراندیش وزراء صرف اس جرم میں اس دنیا سے جانے پر مجبور کئے گئے۔ یا جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں ڈالے گئے کہ انہوں نے اپنی حفاظت کا جائز اقدام کیوں کیا۔ اور اپنے ملک و مال کو غیر ملکی مہذب ڈاکوؤں کی دست برد سے بچانے کی جرأت کیوں کی۔

شاعر اور ادیب

دلی کالج کے پروفیسر، جلیل القدر شاعر و مصنف امام بخش

صہبائی بھی اپنی آزاد خیالی کے باعث دشمنوں کے حملے سے نہ بچ سکے۔ مرزا غالب صہبائی کے قدر دان اور حضرت سر سید ان کے ارادتمند تھے۔ صہبائی اور ان کے دو بیٹوں کو غدر کے الزام میں توپ سے اُڑا دیا گیا۔ اور ان کی لاشیں دریا میں پھنکوا دی گئیں۔

مفتی صدر الدین آزردہ نے جو فارسی اور اردو کے زبردست عالم تھے۔ ایک فارسی مرثیہ میں جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں اپنے درد دل کا اظہار کیا ہے

ندانم کجا رفت آں نعشِ پاک — فلک بردہ یا ماند چو روئے خاک

ندانم کسے داد او را کفن — دیا ماند چوں سایہ بر خاک تن

ندانم چہ کرد است با او سپہر — زجامہ کفن کرد یا تابِ مہر

نمائش نمودند او را نہاں — دیا مرتفع شد سوئے آسماں

کسے فاتحہ ہم براو خواندہ است — بعطرِ گلابی بر افشاندہ است

کدامی گل و بلبل و یادِ دشت — بخاکش بجسنِ عقیدت گذشت

الٰہی بیامرز مظلوم را — کلاہِ شہی دہ بملکِ بقا

بفردوس اعلیٰ بود جائے او

بہشت بریں باد ماوائے او

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو بغاوت کے الزام میں سات سال کی قید کا حکم ہوا۔ وہ اُردو فارسی کے بڑے خوش فکر شاعر تھے غالبؔ کو ان سے بے انتہا محبت تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مصطفےٰ خاں کا حال سُنا ہوگا۔ خدا کرے۔ مرافعہ میں چھوٹ جائیں۔ ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس نازپروردہ میں کہاں۔"

منشی محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی نے غدر میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ اُن کو بالآخر قید کر کے انڈمان بھیجا گیا۔ وہاں انہیں جو تکلیفیں ہوئیں۔ انہوں نے ایک قطعہ کی صورت میں پیش کیں ہیں۔

فرخ آباد اور یارانِ شفیق ۔۔۔ چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے
آئے باندے میں مقید ہو کے ہم ۔۔۔ سو طرح کی ذلّت و تحقیر سے
کوٹھڑی تاریک پائی مثلِ قبر ۔۔۔ تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
پھر الٰہ آباد لے جائے گئے ۔۔۔ ظلم سے تلبیس سے تزویر سے
جو الٰہ آباد میں گذرے ستم ۔۔۔ ہیں فزوں تقریر سے تحریر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں ۔۔۔ گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے

ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں
ناتواں تر قیس کی تصویر سے

منیر سات سال کے بعد انڈیمان سے رہا ہوئے۔ یہ زمانہ انہوں نے کس مصیبت سے گذارا۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہوسکتا ہے۔ جو انہوں نے رہائی کی خوشخبری سن کر لکھے تھے:۔

رخصت اے دوستانِ زندانی الفراق اے ہجوم ناچاری
دال چاول سے کہہ دو رخصت ہیں ڈوبے پانی میں یہ نمک کھاری
مچھلیوں سے کہو کہ ہٹ کے مریں گھاس کھودے یہاں کی ترکاری
چینی، برمی، ملاقی، مدراسی اہلِ آسام اور تاتاری
اپنے دیدار سے معاف کریں اپنی باتوں سے دیں سبکساری
کالے پانی سے ہوتے ہیں رخصت اشکِ شادی ہیں آنکھ سے جاری
بیٹھتے ہیں جہازِ دوری پر اٹھتے ہیں لنگرِ گراں باری
نکلے دریائے شور سے صد شکر بحرِ شیریں کی آ گئی باری
نظر آیا۔ سوادِ کلکتہ
شکر صد شکرِ حضرتِ باری

انور پاشا

جن نامور ہستیوں نے اسلام اور ملت کی خاطر اپنی جانیں نثار کر دیں۔ ان میں انور پاشا نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی ساری عمر ملک کی حفاظت۔ قوم کی خدمت اور اسلام کے لئے جہاد میں گذری جب جنگ عظیم میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ اتحادی بیڑا درہ دانیال آ پہنچا۔ اور قسطنطنیہ پر اتحادی قبضہ ہو گیا۔ تو بہادر انور پاشا نے یہی مناسب سمجھا۔ کہ ترکی سے نکل کر کسی دوسرے محاذ پر کام کرے۔ اور وہ وسط ایشیا میں چلے گئے۔

انور پاشا چاہتے تھے کہ روس سے ساز باز کر کے ترکی کو امداد پہنچائیں۔ اور ان کی ذاتی خواہش تھی کہ ترکستان، داغستان آذربائیجان، افغانستان، عرب، ایران، مصر، شام وغیرہ سے

اتحاد پیدا کیا جائے۔
انور پاشا اسلامی ترکستان کو روس کے جوے سے آزاد کر کے ایک خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کے آرزومند تھے۔
انور پاشا روسیوں کے بڑے دوست تھے۔ جب ماسکو پہنچے۔ تو روس نے بولشویکوں کی ایک فوج ان کے ساتھ بخارا روانہ کی کہ اہل بخارا اور روسیوں کے درمیان پڑ کر صلح کرا دیں۔ ابھی یہ کام انجام نہ پایا تھا۔ کہ انور پاشا روسیوں کی پالیسی ان کے معتقدات اور مخالفت اسلام خیالات سے متاثر ہو کر اہل بخارا سے مل گئے اور ترکستان میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ روس یہ کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے ٹڈی دل فوج کے ساتھ انور پاشا پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا۔ مگر ہر قدم پر ناکامی نظر آنے لگی۔
زندگی کے آخری دن انور پاشا بلجوان میں تھے۔ اس وقت ان کے ساتھ سولہ نوجوان ہندی مہاجر تھے۔ ۴ر اگست ۱۹۲۲ء عیدالضحیٰ کی صبح کو بیدار ہوئے۔ نماز صبح سے فارغ ہو کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اور اپنے رفیقوں کو بلا کر کہا ؎
"دوستاں دیدم بخواب امشب کہ می گردم شہید

خویشتن را از بہرِ دیں در عیدِ قرباں مے کنم"

"میں آپ کا بڑا افسر اور کمانڈر تھا۔ اور چونکہ آپ پر میری طرف سے کوئی سختی ہوئی ہوگی۔ اس لئے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں اور التجا کرتا ہوں کہ میرے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔"

یہ بات سنکر دوستوں کے دل دھڑکنے لگے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ سب نے اپنے بہادر اور پیارے رہنما کو محبت کی نظروں سے دیکھا۔ اور تسلیاں دینی شروع کیں۔

اتنے میں نمازِ عید کا وقت آگیا اور نمازِ عید پڑھنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ ادائے نماز کے بعد جو لوگ کیمپ کی حفاظت کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر عید کی رسمیں ادا کرنے کے لئے اپنے دوستوں میں مل گئے۔

اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر دفعتہً دشمنوں نے حملہ شروع کر دیا۔ ہندی مجاہدین میں سے چار اشخاص کو جو کہ گولہ اندازی میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ پہاڑ پر چڑھ کر توپ چلانے کا حکم دیا۔ خود شیر کی طرح گرجتے ہوئے میدان میں آئے۔ دشمنوں کے بے شمار آدمیوں کو تہِ تیغ کیا۔ باقی بارہ مہاجرِ ہندی بھی تیغیں سوت کر مقابلہ کے لئے آگے بڑھے۔ کچھ دیر تک جنگ و جدل کا بازار گرم رہا۔

اس کشمکش میں ایک گولی غازی انور پاشا کے دائیں شانے پر لگی۔ اور کرِچ آپ کے دائیں ہاتھ سے گر پڑی۔ بائیں ہاتھ سے اسے سنبھال کر لڑتے رہے اور کئی ایک کو جہنم واصل کیا۔ مگر افسوس کہ دوسرے شانہ پر بھی گولی لگی اور پھر آناً فاناً دشمن کی ایک تلوار گردن پر پڑی کہ وہ لاثانی بہادر اور اسلام کا نامور فرزند ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بارہ بہادر ہندی مہاجروں نے بھی غازی کی پیروی کی اور اسی جگہ جامِ شہادت نوش کیا۔ اسلامی فوج کے کچھ بہادر سپاہی بھی اس شور و غوغا میں وہاں پہنچ گئے۔ اور ان میں سے بھی اکثر بہادرانہ جنگ کے بعد جنّت کو سدھارے۔

شہادت کے چوبیس گھنٹے بعد تیس ہزار مسلمان روتے ہوئے آپ کی نعش اُٹھا کر لے گئے۔ نماز جنازہ ادا کی۔ اور انہیں موضع تجوان میں سپردِ خاک کیا۔ آپ کی قبر پر بارہ حافظ مقرر کئے گئے جو رات دن قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ ہر روز ہزاروں مسلمان آکر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ آپ کا مقبرہ ایک عظیم الشان زیارت گاہ بن گیا ہے۔

ادا کردند خویش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

فتحِ ادرنہ

گیلی پولی میں جو پہنچی یہ خبر انور کو
قبضۂ غیر میں جاتا ہے ایڈریا نوپل

صورتِ برق تڑپنے لگا دل سینے میں
چھا گئے سامنے آنکھوں کے الم کے بادل

وقتِ غفلت نہیں۔ لازم یہ بہر صورت ہے
اس شرارت کا بہت جلد کریں ردِ عمل

ہو گئے اسپِ سبک گام پہ فی الفور سوار
آس کا عزم سفر میں نہ کسی طرح خلل

بیسیوں میل کی اک شب میں مسافت طے کی
سدِ رہ گرچہ تھے رستے میں کئی شعب و جبل

نوٹ:۔ یہ واقعہ ۱۹۱۲ء کا ہے۔ جبکہ جنگِ بلقان زوروں پر تھی۔ اور ترکی کے یورپی مقبوضات بغاوت پر تلے ہوئے تھے۔

باب عالی میں سحر ہوتے ہی وہ جا پہنچے
چل پڑے سوئے ادرنہ وہیں بابانگ دہل

ناگہاں واں جو ہوا ان کا نزولِ اجلال
جیشِ اسلام گیا دیکھ کے فی الفور سنبھل

نامِ انور جو سنا اڑ گئے دشمن کے حواس
پڑ گئی لشکرِ تثلیث میں بے حد ہلچل

ایک ہی حملۂ پُر جوش میں یہ حال ہوا
نہ رہا جذبۂ قیصر نہ جلالِ ہرقل

بد حواسی میں جدھر سینگ سمائے بھاگے
کوئی گھوڑے پہ سوار اور کوئی تھا پیدل

فاتحانہ جو ہوئے شہر میں داخل انور
فرشِ رہ کوچۂ بازار تھے - حیران محل

نعرے مسلم کے ادرنہ کی فضا میں گونجے
پھولے جاموں میں سماتا نہ تھا اسلام کا دل

نشرِ فرخ جو ہوئی یہ خبرِ حیرت خیز
بے بدل خلق میں سمجھا گیا انور کا عمل

مصطفےٰ الکمال پاشا

مصطفےٰ الکمال پاشا ـــــــ ایک یتیم بچہ تھا۔ اس کی سرپرست اس کی کمزور والدہ تھی۔ باپ اُسے چھوٹی عمر میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مصطفےٰ کا نگران حالِ شکستہ دل ماں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنی ہمت اور کوشش سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ جنگی کالج میں داخل ہوا۔ فوج میں بھرتی ہو کر بڑے بڑے خطرناک محاذات پر دادِ شجاعت دی۔ جرمن جرنیل اور وزیرِ جنگ سے اکثر اختلاف رہا۔ مگر مصطفےٰ کمال کی رائے صائب ہوئی۔

اکتوبر ۱۹۱۸ء میں جب جنگِ عظیم کے خاتمہ پر ترکوں نے ہتھیار ڈال دیئے، سلطان پر انگریزی اقتدار غالب آیا۔ اور قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا۔ تو ترکانِ احرار پر ایک آفت نازل ہو گئی

قوم پرست لیڈر گرفتار کئے گئے۔ جلاوطن کئے گئے۔ یا خود بخود وطن سے نکل گئے۔

کمال قسطنطنیہ سے نکلا، اور ایشیا کی طرف چلا گیا۔ اور اپنے ہم مشرب لوگوں کو اناطولیہ آنے کی دعوت دی۔ پھر کیا تھا۔ تمام آزاد خیال محبانِ وطن مصطفےٰ کمال کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے مصطفےٰ کمال نے کچھ دن غور و فکر کے بعد انگورہ میں ایک نئی حکومت قائم کر دی۔ اپنی حفاظت و مدافعت کا سامان شروع کر دیا۔

مگر مصیبت یہ تھی کہ ان کے پاس نہ روپیہ تھا۔ نہ سامانِ جنگ اور نہ فوج۔ اُدھر ایک طرف جنرل انزادر پاشا اور علیمان حفیظ جیسے غدار قسطنطنیہ سے حملہ آور ہوتے۔ اور دوسری طرف یونانی سفاک سمرنا سے نکل نکل کر عسکی شہر کی طرف آ رہے تھے۔ لیکن مصطفےٰ کمال کی ذہنی قابلیت، عملی استعداد اور جنگی کمالیت نے چند ہی ماہ میں اناطولیہ کو دشمنوں سے پاک و صاف کر دیا۔

خدا کی شان قسطنطنیہ والے شکست کھا کر اپنی حقیقت سے واقف ہو گئے۔ بلکہ مصالحت کے لئے کوشش کرنے لگے۔ اور یونانی اپنی طاقت اور اتحادیوں کی مدد کے زعم میں اتنے بڑھ گئے۔ کہ اپنا مرکز بھول گیا۔ وہ انگورہ کی تسخیر کے خواب دیکھ رہے

تھے۔ مصطفےٰ کمال شیر کی طرح گرجتا ہوا نکلا۔ اور یونانیوں کو سمندر کی طرف دھکیل دیا۔ شاہ یونان جو بنفس انگورہ کو فتح کرنے کے خیال سے سمرنا میں مقیم تھا۔ بے نیل مرام واپس گیا۔

غرضیکہ چند سال میں سلطنت انگورہ ایک مضبوط سلطنت بن گئی۔ ہر طرح کا انتظام مکمل ہوگیا۔ اتحادیوں نے سر تسلیم خم کیا۔ مختلف کانفرنسیں ہوئیں۔ مدانیہ میں۔ سیورے میں۔ لوزان میں ہر جگہ ترکوں کو کامیابی ہوئی۔ قسطنطنیہ مل گیا۔ دردانیال اور بحیرہ مارمورا آزاد ہوگئے۔ مصطفےٰ کمال کو قسطنطنیہ میں ایک باغی قرار دے کر سزائے موت کا حکم دیا گیا تھا۔ اب وہی باغی حکومت کا ترکی صدر تھا۔ اور تا دم زیست صدر ہی رہا۔

ترکی کا مرد بیمار جسے یورپ کے سیاسی ڈاکٹر ختم کر چکے تھے۔ بالکل تندرست ہوگیا۔ اور اپنے عمل سے اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔ جو لوگ ترکی کے خون بھرے ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کے روادار نہ تھے گلے ملنے کے لئے تیار ہوگئے۔

لارڈ کرزن نے لوزان کانفرنس کے صدر نے ——————

لوزان کانفرنس کے اختتام پر جو تقریر کی۔ اس میں کہا:۔

ہم نے ترکوں سے ان شرائط پر صلح کی ہے۔ جو ایک

مفتوح قوم فاتح قوم سے کرتی ہے۔

مصطفےٰ کمال کو خوش قسمتی سے جنرل عصمت پاشا۔ غازی علی خالد۔ خالدہ ادیب خانم وغیرہ جیسے بہت سے مشیرانِ کار مل گئے۔ جن کی مساعی ٹرکی کی حیاتِ ثانیہ کا موجب ہوئیں۔

یورپ کے اکثر سیاح۔ مدبر اور اخبار نویس انگورہ آئے۔ اور مصطفےٰ کمال کی ملاقات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں ہمہ صفت موصوف انسان تسلیم کرنا پڑا۔

مصطفےٰ کمال جیسا بہادر جرنیل تھا۔ ویسا ہی انتظام ملکی کا ماہر۔ وہ جیسا زبردست مقرر تھا۔ ویسا ہی اعلیٰ پایہ کا مصنف کوئی طاقت اس کے عزم کو متزلزل نہ کر سکتی تھی۔ اور کوئی استدلال اُن کے خیالات کو بدل نہ سکتا تھا۔ ایک ایک تقریر کئی کئی دن جاری رہتی۔ جماعت دستور (مجلس ملی) اکثر دفعہ ایسا ہوا کہ مخالف جماعت مخالفت پر تیار ہو کر آئی۔ مصطفےٰ کمال علیحدہ اپنی جگہ پر خاموش ہے۔ ایوان میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں منصوبے سوچے جا رہے ہیں ——— کام شروع ہونے کا وقت آیا۔ اور سپیکر (صدر مجلس) نے ایک دو دفعہ میز پر پنسل کی ضرب لگائی مصطفےٰ کمال وقار سے اٹھا۔ صدر کے پاس آ کر تقریر شروع

کی۔ اور تمام موضوعات پر اس خوبی۔ معقولیت اور متانت سے گفتگو کی۔ کہ رفتہ رفتہ مخالفیں کی آنکھیں نیچی ہوگئیں۔ سر جھک گئے ہمہ تن گوش ہو کر سُن رہے ہیں —— تقریر ختم ہوئی —— ہر طرف سے تحسین کی صدا بلند ہوتی ہے۔ اور کوئی مخالف اعتراض کے لئے نہیں اٹھتا۔

مصطفےٰ کمال ارادوں کا پکا۔ اصول کا دلدادہ۔ نہایت مستقل مزاج۔ بہادر اور دلیر تھا۔ اپنے معاملات میں کسی کا دخل پسند نہیں کرتا تھا۔

لطیفہ خانم اُن کی بیوی کو صرف دو سال میں علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ کیونکہ وہ اُن کے فرائض منصبی اور سیاسی معاملات میں دخل دینے لگ گئی تھیں۔

مصطفےٰ کمال ساری عمر قوم کے سود وبہبود اور ملک کی آزادی و فلاح کے لئے سربکف رہا۔

آخری ایام میں وہ سخت بیمار تھا۔ تشنج کے دورے پڑ رہے تھے۔ مگر شیر دل تکالیف سے بے پروا اور موت کے خوف سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مصروف تھا۔ باہر اسلامی وفد حیران و پریشان بیٹھا تھا۔ اور وہ اتحاد اسلامی کی سکیم مرتب کر رہا تھا۔

انجام کار اسی کشمکش میں جان خدائے جان آفریں کے سپرد کر دی۔

رفتی و کارہا ہمہ درہم گذاشتی
آشفتگی بمردم عام گذاشتی

کلام مجید کی عظمت

غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے عیدالفطر (۱۹۳۵ء) کی تقریب سعید پر ایک پیغام قوم کے نام نشر کیا۔ جس کو نظم کی صورت میں ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

بطل جلیل۔ حامیٔ دیں۔ مصطفےٰ کمال
جن پر ہے آج ملت اسلامیہ کو ناز
وہ پیکرِ جمال وہ سرچشمۂ جلال
رونق فزا تھا صورتِ محمود میں ایاز
جلسہ ہوا تھا مجلسِ ملّی کا منعقد
تقریب عید فطر پہ با شان و امتیاز
ارکانِ باوقار کا مجمع تھا پُر شکوہ
خطبہ دیا اک اس نے دل افروز و جاں نواز

پروانہ وار مضطرب و بیقرار تھا
با چشم زار ہم صفتِ شمع جاں گداز
ڈوبا ہوا تھا سوز میں گویا ہر ایک لفظ
جیسے بنے تھے قلب و جگر پردہ ہائے ساز
قرآنِ پاک سینہ سوزاں کے ساتھ تھا
فرمایا اہلِ بزم سے یہ از رہِ نیاز
"اے قوم! اس کلامِ مقدس پہ کر عمل
دنیا و دیں میں تجھ کو جو ہونا ہے سرفراز"

(فرخ)

سردار احمد علی جان کی شہادت

سردار احمد علی جان سلطنت افغانستان کے مختلف ذمہ دار عہدوں پر مامور رہے۔ وہ امیر حبیب اللہ خاں کے داماد اور شاہ امان اللہ خاں کے بہنوئی تھے۔ انہیں شاہی خاندان اور ملک میں بڑا اقتدار حاصل تھا۔

جب امان اللہ خاں بچہ سقہ سے شکست کھا کر افغانستان سے چلے گئے۔ تو علی احمد جان نے قندھار میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ لیکن بچہ سقہ نے قندھار پر بھی حملہ کر کے فتح حاصل کی۔ اور سردار علی احمد جان کو گرفتار کر لیا۔

چند روز بعد بچہ سقہ نے کابل میں منادی کرا دی کہ سردار علی احمد جان سابق والئے کابل کو بحالت اسیری کابل کے بازاروں

میں پھرایا جائے گا۔اہلِ شہر پر غم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔اس صدمہ سے دل وجگر خون ہو گئے۔ہرایک کی آنکھیں نمناک تھیں۔لبوں پر آہ وفغاں۔جب آمد آمد کی اطلاع ہوئی۔طالبان دیدار گذرگاہ میں جمع ہو گئے۔بازاروں میں عوام کا ہجوم تھا۔مکانوں کے دریچوں اور چھتوں پر خلقت ہی خلقت نظر آتی تھی۔سب سے آگے کوتوال شہر تھا۔اس کے پیچھے فوج کا دستہ۔بعدازاں سردار علی احمد جان سر ننگے، ایک خاکی قمیض اور معمولی پاجامہ پہنے ایک رفیق کے ساتھ آرہے تھے پاؤں میں چپلی تھی۔دونوں کے بازو پگڑی سے باندھے ہوئے تھے ان کے پیچھے دو اور ہمراہی اسی ہیئتِ کذائی میں آرہے تھے۔ان کے پیچھے پھر فوج تھی۔یہ تھکے ماندے اسیرانِ بلا جب چند قدم چل کر ٹھہر جاتے تو اپنے آشناؤں کی طرف نہایت یاس انگیز محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے۔عوام پر خوف وہراس کا عالم طاری تھا۔کوئی زبان سے ایک حرف نہیں نکال سکتا تھا۔ذرا کسی نے اس جلیل القدر انسان کی طرف ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا۔تو بندوق کا رُخ اس کی طرف ہو گیا۔غرضیکہ اس روز کابل میں ایک محشر بپا تھا۔ہر شخص سوگوار اور ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ہر ایک کے دل سے یہ صدا اُٹھتی۔اور زبان پہ آکر رُک جاتی ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھُٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

جب سقائی دربار کے دروازے پر پہنچے۔ تو دربان نے طعن و تشنیع سے کام لیا۔ سردار صاحب نے اس کو اور بچہ سقہ کو صلواتیں سنائیں۔ جب بچہ سقہ کے سامنے پیش ہوئے، تو اس نے کہا:۔

"تم ہی والیِ کابل تھے۔ اور تم نے ہی قندھار میں اپنی بادشاہی کا اعلان کیا تھا۔ اب تمہاری کیا حالت ہے۔"

سردار:۔ "ہاں! وہ میں ہی ہوں۔ اور میں ہی اس کا مستحق تھا کہ امان اللہ خاں کے بعد تختِ کابل پر بیٹھتا۔ مگر قسمت نے یاوری نہ کی۔"

بچہ سقہ:۔ (ہنس کر) قندھار میں بھی تم بادشاہ بنے۔

سردار:۔ امان اللہ خاں بزدل تھا۔ بھاگ گیا۔ لیکن میں بہادر ہوں۔ بہادروں کی طرح تمہارا مقابلہ کیا۔ شکست و فتح خدا کے ہاتھ میں ہے۔

بچہ سقہ:۔ اب تمہارا کیا علاج؟

سردار :۔ تمہیں تین دفعہ گرفتار کر کے چھوڑ دیا تھا۔ اب جو تمہاری مرضی ہے کرو۔

بچہ سقہ :۔ "تم میری اطاعت قبول کرو۔"

سردار :۔ (غضب ناک ہو کر) چاہے تو میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دے۔ میں تجھے بچہ سقہ کے سوا کچھ نہ کہوں گا اور نہ تمہاری بیعت کروں گا۔ تیرے جیسا چور ڈاکو اور رہزن تختِ کابل کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

بچہ سقہ خاموش ہو گیا۔ سردار احمد علی جان نے پانی مانگا۔ ایک نوکر نے پانی لا کر دیا جو گرم تھا۔ سردار احمد علی جان نے ایک گھونٹ پی کر کہا "یہی تمہاری بادشاہی ہے۔ جہاں ٹھنڈا پانی بھی میسر نہیں"۔ بچہ سقہ نے ٹھنڈا پانی لانے کا حکم دیا۔ جب پانی پی لیا تو قید خانہ میں بھیج دیا۔

تقریباً ایک مہینہ کے بعد پھر بچہ سقہ کے سامنے پیش کئے گئے۔ اس کے قاضی نے فتویٰ دیا۔ کہ "چونکہ علی احمد جان نے امیر المومنین بادشاہ اسلام کے خلاف بغاوت کی ہے۔ لہذا اس کی سزا قتل ہے۔ اس کو قتل کیا جائے۔"

بچہ سقہ نے کہا۔ ایک شرط پر یہ تمہاری جان بخشی ہو سکتی

ہے۔ اور وہ یہ کہ اپنا تمام روپیہ میرے حوالے کر دو۔ ورنہ توپ سے اڑائے جاؤ گے۔

سردار علی احمد جان نے کہا "تم کو شرم نہیں آتی۔ کہ تخت حکومت پر بیٹھ کر بھی تمہارے وہی ڈاکوؤں جیسے خیالات ہیں۔ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا۔ تو میں تمہاری کھوپڑی میں پانی پیتا۔ اور تخت سے اتار دیتا۔ میں تم کو بادشاہ تسلیم نہیں کرتا۔ تم وہی ڈاکو ہو۔ صرف اتنا کہتا ہوں۔ کہ مجھے توپ سے نہ اڑایا جائے۔ بلکہ چاند ماری کی جائے۔"

مگر ظالم بچہ سقہ نے یہ بات نہ مانی اور کہا وہ توپ سے اڑائے جائیں۔ جب آپ توپ کے پاس لائے گئے۔ تو خاکی کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سر پر کمبل تھا۔ بچہ سقہ نے حکم دیا۔ کہ انہیں توپ کے منہ کے آگے باندھا جائے۔ جب توپ کے منہ کے آگے جکڑے گئے۔ تو ہاتھوں کی ہڈیاں چکنا چور ہو گئیں مگر پیشانی پر بل تک نہ تھا نہ ہی آنکھ جھپکی۔ وہ اس وقت پریشان نظر نہیں آتے تھے۔ بلکہ مسکرا رہے تھے۔ اس اثنا میں توپ کا فائر ہوا۔ صرف ہاتھ اور پاؤں جو کہ باندھے گئے تھے۔ رہ گئے تھے۔ باقی تمام بدن اڑ گیا۔

شاہیں کی موت

شاہیں جو ہوا موت کے پنجے میں گرفتار
اس پر نہ تھے طاری الم و یاس کے آثار
اک جشنِ مسرت تھا بپا زاغ و زغن میں
عیش اور خوشی کے تھے دو توم میں افکار
تھی نزع کی حالت میں وہی شان خودی کی
سوتے تھے نصیب اس کے مگر روح تھی بیدار
لرزاں نہ ہوئی۔ اور نہ جنبش تھی پروں میں
لبریز نہ اشکوں سے ہوئی چشمِ پُر انوار
کس درجہ ستم خیز تھا وہ لمحۂ آخر
ساکت تھی فضا۔ کانپ اٹھا گنبدِ دوار

نادر شاہ شہید

۱۹۱۹ء میں جب ہندوستان کی پولیٹکل تحریک زوروں پر تھی رولٹ ایکٹ کی وجہ سے تمام ملک میں جبر و تشدد کا سلسلہ جاری تھا پنجاب کے بڑے بڑے لیڈر جیلوں میں جا چکے تھے۔ ان حالات سے افغانستان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور سرحد پر جنگ چھڑ گئی۔ جو بہادر جرنیل ٹل کے علاقے تک پہنچ گیا۔ وہ افغانستان کا سپہ سالار جنرل نادر خاں تھا۔ انگریز گھبرا گئے۔ اور افغانستان سے صلح کرلی۔ افغانستان جو پہلے انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا۔ ایک آزاد ملک بن گیا۔

اس کے بعد جب امان اللہ خاں سیاحت یورپ کے لئے گیا۔ اور وہاں وہ بادۂ تہذیب سے اس قدر سرشار ہوا۔ کہ واپسی

پر اس نے اپنی قوم کو اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اس نئی تہذیب کا اثر قبول کرنے کیلئے آمادہ نہ ہوئے۔ ملک میں بغاوت ہوگئی۔ اور دس سال کا حکمران تاب مقاومت نہ لاسکا اسے اپنی قوم کو "بچہ سقہ" ڈاکوؤں کے سردار کے بس میں چھوڑ کر چلے جانے کے سوا چارہ کار نظر نہ آیا۔ بچہ سقہ نے نو ماہ کی حکومت میں انتہائی مظالم کئے۔ بڑے بڑے بہادر سپاہیوں کو توپ دم کیا۔ پھانسی پر چڑھایا۔ گولیوں کا نشانہ بنایا۔ لوگوں کا زر و مال لوٹا۔ پاک دامن اور شریف عورتوں کی عصمت خراب کی۔ گویا اس نے اور اس کے ہمراہیوں نے افغانستان کے دارالسلطنت کابل میں قیامت برپا کر دی۔

جون ۱۹۲۹ء میں امان اللہ خاں اپنے اہل و عیال سمیت اٹلی اور سردار عنایت اللہ خاں اپنے بیوی بچوں کو لے کر ایران چلا گیا۔

جنرل نادر خاں اس وقت پیرس میں افغانی سفیر تھا۔ اسے جب یہ حالات معلوم ہوئے تو وہ یکہ و تنہا کابل کو روانہ ہوا۔ اور سرحد افغانستان کے لوگ بچہ سقہ کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ سب نادر خاں کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

بچہ سقہ نے بہت سی چالیں چلیں۔ کہ کسی طرح نادر خاں کے ساتھ مصالحت ہو جائے۔ مگر نادر خاں کے پیشِ نظر یہی مصلحت تھی۔ کہ بچہ سقہ کے ناپاک داغ کو دامنِ افغانستان سے دُور کیا جائے چند ہی روز میں اس کی طاقت کا خاتمہ کر دیا۔ نادر خاں کا بہادر اصغر ولی خاں فاتحانہ کابل میں داخل ہوا۔ بچہ سقہ اور اس کے ساتھی گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکائے گئے۔

اس فتح کے بعد نادر خاں، نادر شاہ کے نام سے تختِ کابل پر بیٹھا اور اپنے بھائیوں کو وزارت قائم کر کے سلطنت شروع کی۔ مگر ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا۔ اور وہ ملک کی خوشحالی کے لئے خاطر خواہ کام نہ کر چکا تھا۔ کہ ایک تقریب پر ایک بدخواہِ قوم طالب علم نے نادر شاہ کو شہید کر دیا۔

اس واقعہ سے تمام افغانستان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور خیال کیا گیا۔ کہ اس کی تہ میں کسی گہری سازش کا ہاتھ ہے۔ مگر جو ہونا تھا، ہو گیا۔ اور ایک بہادر سپہ سالار نے ملک کو ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے نجات دلائی۔ اور رفاہِ قوم کے لئے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے پر مجبور ہوا۔ اپنے دل کے ارمان نہ نکال سکا اگر وہ زندہ رہتا تو سلطنت افغانستان بہت ترقی کرتی۔ مگر قدرت

کو یہی منظور تھا۔ خدا اس محبِ قوم فرزندِ اسلام کے مزار پہ اپنی رحمت کے پھول برسائے۔

نادر شاہ افغان

حضورِ حق سے چلا لے کے لولوئے لالہ
وہ ابر جس سے کہ اِک گُل ہے مثلِ تارِ نفس
بہشت راہ میں دیکھا تو ہوگیا بے تاب
عجب مقام ہے جی چاہتا ہے جاؤں برس
صدا بہشت سے آئی کہ منتظر ہے تیرا
ہرات کابل و غزنی کا سبزہ نورس
سرشکِ دیدہ نادر بہ داغ لالہ فشاں
چناں کہ آتشِ او را دگر فرو نہ نشاں

(اقبال)

شہیدانِ پشاور

مسلمان بہادر مشہور ہے۔ وہ جس کام کا بیڑا اٹھالے اس سے گریز نہیں کرتا۔ ہندوؤں نے کانگرس کی تحریک شروع کی تو پچیس تیس سال تقریریں کرتے، ریزولیشن پاس کرتے اور جیلوں میں جاتے رہے۔ اُن کا بہادر جرنیل میدان میں آیا تو کہا: روٹھ جاؤ۔ لاٹھیاں کھاؤ۔ اور قید میں جاکر پڑ رہو؟

جب مسلمان کانگرس میں شامل ہوئے۔ تو انھوں نے ستیہ گرہ نہیں کی۔ مجرموں کی طرح قید ہونا گوارا نہیں کیا۔ پولیس کی لاٹھیاں نہیں کھائیں۔ اور بے بال و پَر جانوروں کی طرح اسیرِ قفس نہیں ہوئے۔ مردانہ وار میدان میں آئے اور حکومت کے ساتھ مقابلے کے لیے سینہ سپر ہوگئے۔

اپریل ۱۹۳۰ء میں کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک جاری تھی۔ خلاف ورزی قانون کا بازار گرم تھا۔ اور ہندو بہادر نہایت امن سے جیلوں میں جارہے تھے۔

پشاور میں سول نافرمانی ہوئی۔ وہ سول نافرمانی ایک مشغلہ نہیں تھا۔ پٹھانوں کی مقاومت مجہول تھی مسلمانوں کی خلاف ورزیِ قانون تھی۔

۲۲ر اپریل کو قومی کارکنوں کا ایک اجلاس سرحد کے مجاہد لیڈر سید لال بادشاہ صاحب مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ ۲۳ر اپریل سے شراب خانوں پر پکٹنگ کی جائے۔ تاکہ قوم کو اس ام الخبائث سے نجات حاصل ہو جب جمہوریت دشمن حکومت کو اس بات کا علم ہوا۔ تو اس نے بہت سے قومی رہنماؤں اور اراکین کونسل کے مکانات کو محاصرہ میں لے لیا۔ اور صبح ہونے سے پیشتر وار کونسل کے متعدد ارکان گرفتار کر لئے گئے۔ ۲۳ر اپریل کی تاریخی صبح کو شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ چوک یادگار۔ بازار بزازاں اور قصہ خوانی میں لاکھوں انسانوں کا ایک سمندر موجزن تھا۔ وہ فرطِ جوش سے انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ وہ پکار رہے تھے "ہم آزادی چاہتے

ہیں۔ ہم آزادی لیں گے" ۔ قومی رہنما یکے بعد دیگرے اپنے تئیں گرفتاری کے لئے پیش کر رہے تھے ۔ انگریز ڈپٹی کمشنر صاحب کابلی تھانہ کے پاس کھڑا دلدادگان آزادی کے پرامن ہجوم کا نظارہ کر رہا تھا۔ عوام اپنے لیڈروں کو آزاد کرانے کے مضطرب تھے ڈپٹی کمشنر پبلک کے اس اضطراب کو برداشت نہ کر سکا۔ اور فوجی ہیڈکوارٹر میں فون کیا کہ شہر کا امن خطرے میں ہے ۔ لہذا مشین گنیں بھیج دی جائیں۔

ڈپٹی کمشنر کے حکم کے مطابق مشین گنیں دندناتی ہوئی آئیں۔ اور چند نہتوں کو کچلنے کے بعد کابلی تھانہ کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ عوام جمہوریت کشوں اور درندہ صفت انسانوں کی اس حرکت سے مشتعل ہو گئے ۔ وہ اپنے بھائیوں کا اس طرح بھیڑ بکریوں کی طرح کچلا جانا دیکھ نہ سکے ۔ ایک مجاہد علاؤالدین شاہ ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا ۔ اور اس نے سر ہتھیلی پر رکھ کر مشین گن کو آگ لگا دی ۔ ایک انگریز فوجی افسر ریوالور پر ہاتھ رکھے ۔ پوری فرعونیت کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اپنی خونخوار فوج پر اترا رہا تھا کہ غازی عبدالرحمٰن سقہ میدان میں آ گیا ۔ اور اس نے تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی گردن اڑا دی ۔ دشمن مجاہدوں کے اس جذبہ

سے گھبرا اٹھا۔ اُس نے مشین گنوں کے منہ کھول دیئے۔

فوج کو اپنے اسلحہ پر ناز تھا۔ لیکن نہتے مسلمان اپنی روایتی شجاعت سے مسلح تھے۔ پولیس اور فوج نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ مگر یہ نہ رکے آگے بڑھتے گئے۔ لاٹھیاں چلائیں۔ تو ان کے سمند تہور پر تازیانہ ہو گئیں۔ انہوں نے رائفلیں تانیں۔ اور انہوں نے چھاتیاں آگے کر دیں۔ اُدھر سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ اِدھر سے جان بازی کا جذبہ جوش پر آیا۔ سینے پر زخم کھاتے تھے اور گرتے تھے۔ پیچھے والے آگے بڑھتے تھے اور اپنے پیشروں کے ساتھ لپٹ کر موت کی نیند سو جاتے تھے۔ بیشمار بہادر کھیت رہے۔ جانبازوں کی پیش قدمی میں فرق نہ آیا۔ اُن کا قدم پیچھے نہ ہٹا۔

جب پشاور میں ہزاروں انسان خاک و خون میں تڑپ رہے تھے۔ قصہ خوانی کا ذرہ ذرہ برطانوی شہنشاہیت کے ظلم و تشدد کی گواہی دے رہا تھا۔ ہزاروں ماؤں کے لختِ جگر گولیوں کے شکار بنائے جا رہے تھے۔ اسی ہولناک ہنگامے میں ایک آفریدی مجاہد جو مٹی کا تیل لینے بازار آیا تھا۔ برادرانِ وطن کا جذبۂ حریت اور انگریز کی وحشت و بربریت دیکھ کر بیقرار ہو گیا۔ وہ بڑھا

اور تیل کی بوتل ایک گورا سپاہی کے منہ پر دے ماری۔ گورا سپاہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ مجاہد نے اس سے بندوق چھین لی۔ اور دشمنوں کو ڈھیر کرنے کے بعد مورچہ بنانے کے لئے ایک بالاخانہ کی طرف بڑھا۔ لیکن بالاخانہ کے مالک نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ دشمن کے متعدد سپاہی بیک وقت آئے۔ اور اس مجاہد کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ جمہوریت کے دشمنوں نے اپنی بربریت کا وہ بھیانک مظاہرہ کیا۔ جس کو دیکھ کر چنگیز اور ہلاکو کی روحیں بھی لرز اٹھیں

جب قصہ خوانی میں ہزاروں بے گناہ انسانوں کے خون سے سفید بھیڑیوں کی پیاس نہ بجھ سکی۔ تو گلی، کوچوں، چھتوں اور مکانوں پر جو بھی نظر آیا۔ اسے بیدردی کے ساتھ گولی سے اڑا دیا گیا۔ تین روز تک مارشل لا جاری رہا۔ اور اس دوران میں چنگیزیت اپنی پوری سفاکی کے ساتھ کار فرما رہی۔ آزادی چاہنے والوں کو آزادی کا نام لینے سے پہلے ہی ختم کر دیا جاتا۔ جو زبان آزادی کی حمایت میں کھلتی، وہ کاٹ لی جاتی۔ اور جو دل آزادی کے لئے تڑپتا وہ نکال لیا جاتا۔ پرستاران آزادی اور محبان وطن کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر ان کا جذبۂ آزادی کچلنے کے لئے ناکام

سعی کی گئی۔ لیکن قوم اس المناک مگر عظیم الشان قربانی کو بھلا نہ سکی وہ تحریر جو خون سے لکھی جا چکی تھی مٹ نہ سکی۔ حریت پسند شاہراہ آزادی پر بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ سترہ سال کے بعد منزل نظر آنے لگی۔ مگر قوم کو اس تک پہنچنے کے لئے ابھی بیشمار قربانیاں دینی تھیں۔ اس لئے اُسے عروسِ آزادی سے ہمکنار ہونے کے لئے ابھی خون کے دریا میں تیرنا تھا۔ آزادی خون کی بھینٹ چاہتی تھی جو اُسے دی گئی۔

یہ قیامت خیز واقعہ ہندوستان کی تاریخ میں خونیں حروف سے لکھا جائے گا ——— ہندوستان؟ ——— نہیں ——— یہ گنجِ شہیداں ——— بھی پاکستان کے حصے میں آیا ہے۔ یہ دولتِ لازوال ہمیشہ پاکستان کے قبضے میں رہے گی۔ ہر سال ان شہیدوں کی یادگار منائی جائے گی۔ مسلمان کے حوصلے بڑھیں گے۔ اور ملک و ملّت کی حفاظت میں اپنی جانیں نثار کریں گے۔ ہندوستان کو یہ سعادت کہاں نصیب ہو سکتی تھی ؎

سرمدا غمِ عشق بوالہوس را ندہند ۔۔۔ سوزِ دل پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید۔ کہ یار آید بکنار ۔۔۔ ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را ندہند

سرمدؔ

حادثہ مسجد شہید گنج لاہور

مسجد شہید گنج لاہور۔ ایک قدیم اسلامی مسجد تھی جس پر سکھوں نے اپنے عہدِ حکومت میں قبضہ کر لیا۔ اور اس کی جو کچھ بھی بے حرمتی ہو سکتی تھی کی گئی۔ انگریزوں کے زمانے میں مسلمانوں نے اس کی بازیابی کا مطالبہ کیا۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر ایک انسانی اور غیر مذہبی حکومت کے قانون نے مسجد کی حرمت سے محروم کر دیا۔ مسلمانوں کا مصلحت اندیش اور اعلیٰ طبقہ تو خاموش رہا۔ وہ مسجد کی دوڑ دھوپ میں کوچۂ بتاں تک جا کر رہ گیا۔ مگر مسلمانوں کا وہ گروہ جو ہر ایک چیز کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھنے کا خوگر ہے۔ وہ ان مصلحتوں کو بے حقیقت سمجھتا تھا۔ وہ مسجد کو مسجد ہی سمجھتا تھا۔ جب ہزاروں سال کے بعد کعبہ سے بت نکالے

جا سکتے تھے۔ خانہ خدا کی حرمت بحال ہو سکتی تھی۔ تو مسجد شہید گنج کیوں مسجد نہیں ہو سکتی تھی۔ اور سکھوں کو وہاں سے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔

مسلمانوں نے ۱۹۳۵ء میں مسجد پر قبضہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ سول نافرمانی شروع ہو گئی۔ ہزاروں مسلمان جمع ہو گئے۔ پولیس اور فوج بھی مسجد کی حفاظت یا سکھوں کی حمایت کے لئے آ گئی۔ تمام راستے خاردار تاروں سے روک دیئے گئے۔ اور سپاہی بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے۔

ادھر یہ ہنگامۂ قیامت برپا ہونے والا تھا۔ اُدھر مجلس احرار کے اربابِ اقتدار اپنی قیام گاہ میں سیاسی جال بُن رہے تھے۔ کہ کسی طرح وزارت کا ہمائے اقتدار ان کے قبضے میں آ جائے۔ انہیں علم تھا کہ محشر برپا ہونے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ مگر آرام و راحت کے خوشگوار خواب دیکھنے والے ایسی روح فرسا تعبیر دیکھنا کب پسند کرتے تھے۔

جانباز مسلمان جنگلے سے باہر نہ رہ سکے۔ ان کا ولولۂ شہادت آگے بڑھنے کے لئے مجبور کرتا تھا۔ ایک بسم اللہ کر کے تار پھاند کر اندر گیا۔ اور گولی چلی۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے اللہ اکبر

کہہ کر چھلانگ لگائی۔ اور وہ بنگلے کے اندر تھا۔ جاتے ہی گولی لگی۔ اور وہ اپنے ساتھی کے پاس تھا۔ اسی طرح اسلام کے کئی فدائی یکے بعد دیگرے قربانگاہ میں گئے۔ اور چھاتیاں تان تان کر گولیاں کھانے لگے

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا۔ ادھر مسجد کی واگذاری کا فیصلہ ہو رہا تھا کہ ——— دو مصلحت اندیش اور مصالحت کوش اشخاص نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ اور لوگوں کو ورغلا کر یہ سلسلہ بند کر دیا۔ افسوس! ان لوگوں کے دخل در معقولات نے شہیدوں کی دلی آرزو پوری نہ ہونے دی۔ اور بے شمار قربانیاں اکارت گئیں۔

مسجد مسجد ہی رہے گی

جو ہو جائے مسجد پہ غیروں کا قبضہ — بدلتی نہیں اس کی حرمت ذرا بھی
مسلماں کو سمجھے گا حقدار اس کا — ہو دستور ملکی کہ فرمان شخصی
وہ قانون کس طرح قانون ہوگا — ہے قانونِ قدرت کے جو کہ منافی
رہا قبضۂ کفر کعبے پہ صدیوں — بتوں سے ہوا آخر کار خالی

گذر جائیں صدیاں۔ بدل جائے دنیا
بہرحال مسجد مسجد ہی رہے گی

(فرخ)

ایک ہیبت ناک خونیں حادثہ

غدر کے بعد جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہوا۔ تو ہندو محکوم اور مسلمان حاکم دونوں ایک سطح پر آ گئے۔ بلکہ مسلمان مسلمان ہونے کی وجہ سے بدظنی کا شکار ہوئے اور ہندو انگریزوں کے منظورِ نظر بن گئے۔

ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی آٹھ سو سال کی محکومی کا خار کھٹکتا تھا اور وہ ان سے انتقام لینے کی خاموش آگ سینے میں چھپائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی معیت میں آزادیِ ہند کی تحریک شروع کی۔ اور جب کامیابی کی صورت نظر آنے لگی۔ تو رفتہ رفتہ بے نقاب ہو گئے۔ مسلمانوں پہ ثابت ہو گیا۔ کہ اگر ملک آزاد ہو گیا۔ تو وہ انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندو کے

دائمی غلام بن جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے "پاکستان" کا مطالبہ پیش کر دیا۔ جو سات سال کی جدوجہد کے بعد پورا ہو گیا۔ انگریز اور ہندو پاکستان کی علیحدہ اسلامی سلطنت منظور کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ادھر آزادی کا اعلان ہوا۔ اُدھر ہندوؤں نے اسلامی اکثریت کے صوبوں میں بعض غداروں کے معاون بن کر اپنی شمولیت سے ایسی مخلوط وزارتیں قائم کر لیں۔ جو در حقیقت ہندو حکومتیں تھیں۔

خضری وزارت کے خلاف پنجاب میں مسلم لیگ نے سول نافرمانی شروع کی۔ جو ایک مہینہ کی کامیابی کے بعد خضری وزارت کے استعفٰی پر منتج ہوئی۔

اب پنجاب کی کامیاب جماعت مسلم لیگ کی وزارت قائم ہونے کا وقت آیا۔ مگر ہندو سکھ سازش اور انگریز کی اعانت سے فسادات شروع ہو گئے۔ جس کی ابتداء امرتسر سے ہوئی۔ امرتسر میں پانچ ماہ شور و فساد کا بازار گرم رہا۔ سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملے کئے اور مسلمانوں نے ان کا جواب نہایت پامردی سے دیا۔ دیہات میں سکھوں نے

مسلمانوں پر یورش کی۔ مگر ہر جگہ شکست کھائی اور مسلمان کامیاب رہے۔

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء آزادی کا دن تھا۔ لیکن اس سے چند روز پہلے ہی تمام مشرقی پنجاب میدانِ کارزار بن گیا۔ اکالی سکھ، ہندو راشٹریہ سیوک دل اور سکھ ریاستوں کی مسلح فوجیں ایک منظم صورت میں حملہ آور ہوئیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے گھر لوٹے، مکان جلائے۔ عورتوں کی بے آبروئی کی۔ ان کا اغوا کیا۔ مسلمان بچے، جوان بوڑھے سب کو بھالوں تلواروں اور بندوقوں سے قتل کیا۔ ان کے مکانوں اور محلوں پر بم برسائے۔

مشرقی پنجاب کا ہر شہر ہر قصبہ اور ہر گاؤں میدانِ کربلا بن گیا دس لاکھ مسلمانوں کے خون سے وہاں کی زمین لالہ زار بنی۔ دہلی اور یوپی میں بھی مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا گیا۔ ستّر لاکھ خانماں برباد پاکستان کی طرف آنے پر مجبور ہوئے لیکن وحشی سکھوں نے مہاجرین کی ٹرینوں اور پیدل قافلوں پر حملے کر کے ہزاروں کو قتل اور مجروح کیا۔

تمام دنیا اس واقعہ پر حیران تھی۔ تاریخ کے اوراق ابتدائے آفرینش سے ایسا خونیں انقلاب، ایسا ہیبت ناک حادثہ اور ایسا

محشر خیز سانحہ پیش نہیں کر سکے۔

ستر لاکھ انسانوں کا بحالت مجبوری مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے نکل آنا ایک عبرت انگیز واقعہ تھا۔ اتنی تعداد کثیر ہندوستان کو تہ و بالا کر سکتی تھی۔ مگر افسوس! مسلمانوں میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی روح اسلامی تھی۔ اور نہ فوجی تنظیم ہمارے لیڈر فسادات کا رنگ دیکھتے ہی جان بچا کر نکل آئے اور پاکستان میں آکر اپنے مفادات اور لیڈری کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف ہو گئے۔

انجام کار خدائے عز وجل نے مخلص اور جانباز مسلمانوں کی قربانیاں قبول فرمائیں۔ اور خانہ بدوشوں کو ایک ایسا وطن دیا، جس میں وہ بلا شرکت غیرے آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔

ہمیں رنج ہے کہ ساڑھے تین کروڑ بھائی ہندوستان میں رہ گئے لیکن اگر پاکستان کے بغیر ہندوستان آزادی حاصل کرتا۔ تو دس کروڑ مسلمان ایک ہی صدی میں ہندوؤں میں مدغم ہو جاتے۔ یا اپنے اسلامی شعائر و دینی خصوصیات کو کھو بیٹھتے۔ اب اگر پاکستان مضبوط ہو جائے۔ تو ان کا بال بیکا نہیں ہو سکتا۔ اور ان کی ہر طرح مدد کر سکے گا۔

نگاہِ واپسیں

وہ دن کہاں ہیں۔ جب تھا ہندوستاں ہمارا
یہ سرزمیں ہماری یہ آسماں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا۔ وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اُترا تیرے کنارے جب کارواں ہمارا
(اقبال)

ہونے لگے ہیں رخصت صدیوں کے بعد تجھ سے
اب ہوگیا گذارا مشکل یہاں ہمارا
جاتی رہی حکومت، بس ہوگئی سیادت
ہر دم تھا جس زمیں پر سکہ رواں ہمارا
وہ بلبلوں کے نغمے اب بھول کیا سُنیں گے
زاغ و زغن نے چھینا ہے گلستاں ہمارا
چھوڑا اگر تو چھوڑا کچھ بال و پر کتر کے
صیاد کا معاون تھا پاسباں ہمارا
شاہ جہاں کی مسجد تاج اور لال قلعہ
بھارت میں یہ رکھیں گے قائم نشاں ہمارا

پہلو میں بت کدے کے ہم نے حرم[1] بنایا
خالی ہوا بتوں سے پاک آستاں ہمارا
ہم کو مٹانے والے فرخ مٹیں گے خود ہی
باقی سدا رہے گا نام و نشاں ہمارا
(فرخ امرتسری)

---

[1] مراد پاکستان

زعیمِ پاکستان

قائدِ اعظم محمد علیؒ جناح اہلِ قلم تھے۔ ان کی سیفِ زبان کے جوہر دشمنوں کے منصوبوں، مخالفانہ عزائم کو موت کی نیند سلا دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی خدا داد قابلیت اور بہادرانہ عزیمت سے ۳۰ کروڑ ہندوؤں اور پانچ کروڑ انگریزوں کا اس خوبی سے مقابلہ کیا۔ اور ایسی عالم آشکار شکست دی کہ دنیا عش عش کر اٹھی۔ چھ سات سال کے قلیل عرصہ میں ایک جدید اسلامی سلطنت قائم کر دی۔ جو عالمِ اسلام میں سب سے عظیم اور دُنیا کی پانچویں بڑی سلطنت ہے۔

انہوں نے ایک بوسیدہ قوم میں زندگی کی روح پیدا کر دی یا یوں کہئے۔ کہ دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی نیم جان قوم میں روح

بن کر اس کو دنیا کی ایک زندہ قوم بنا دیا۔

وہ کہن سال، لاغر اندام اور نحیف کمزور انسان تھے۔ انہوں نے پاکستان کو ایک سر برآوردہ ملک اور مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بنانے کے لئے اس قدر کام کیا۔ اور تمام پاکستان میں پھر کر اتنی جد و جہد کی۔ جو ایک زبردست۔ جوان اور مضبوط شخص نہیں کر سکتا تھا۔ مرض کے دورے ہو رہے ہیں۔ لیکن ان کا دماغ پاکستان کے استحکام و بقا کے تفکر میں منہمک ہے۔ طاقت جواب دے رہی۔ مگر وہ نظام سلطنت کے دوام کے متعلق تجاویز قلمبند کر رہے ہیں۔ اور آخر اسی جہاد میں اپنی جان عزیز قوم پر نثار کر کے کنج مزار میں آرام کی نیند سو گئے۔

دورِ حاضرہ میں وہ ایک نایاب اور بے بہا ہستی تھی۔ جس نے اپنی قربانی سے افرادِ ملت اور جوانانِ قوم کے سامنے ایک روشن اور تابناک مثال قائم کر دی۔ جو اس تاریک پُر آشوب دنیا میں مشعلِ راہ بن کر مسلمانانِ عالم کی رہنمائی کرے گی۔ خدا حضرت قائداعظم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے کیونکہ انہوں نے دس کروڑ حلقہ بگوشانِ اسلام کو کفر زارِ ہند میں غلامی و بے دینی کے مرض میں مبتلا دیکھ کر اپنی جان قربان کر دی ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
چمن میں جب کہیں ہوتا ہے کوئی دیدہ ور پیدا

وہ ناخدا !

اس کی نگہ سے موجِ بلا پاش پاش تھی
سیلابِ بے پناہ میں ساحل تراش تھی
کشتی میں تھا وہ عزم کا دریا لئے ہوئے

کٹتی تھیں اس کے ہاتھ سے طغیان کی رگیں
فرعونیت کی ظلمتِ ہامان کی رگیں
گویا کلیم تھا یدِ بیضا لئے ہوئے

ہر داخلی و خارجی طوفاں سے محوِ رزم
بڑھتا چلا گیا سوئے ساحل اُسی کا عزم
سر میں ادائے فرض کا سودا لئے ہوئے

ملت کو گمرہی سے بچاتا ہوا بڑھا
تاریکیوں میں شمع جلاتا ہوا بڑھا
علم و یقین و دیدۂ بینا لئے ہوئے

موجیں اُٹھیں۔ لپک کے بڑھے کام صد نہنگ
وہ دشمنانِ دیں سے لڑا جنگ بید رنگ
ادراکِ بے مثال کا حربہ لئے ہوئے

طوفانِ برق و باد کا منہ توڑتا ہوا!
تختے اُکھڑ رہے تھے۔ انہیں جوڑتا ہوا
نکلا بھنور سے قوم کا بیڑا لئے ہوئے

کشتی پہنچ رہی تھی سرِ ساحلِ مراد
ہم اس کو داد دیتے تھے کہہ کہہ کے زندہ باد
نعروں میں شورِ حوصلہ افزا لئے ہوئے

اس ناخدا کو دستِ خدا نے اٹھا لیا
غازی کو بڑھ کے سایۂ رحمت نے چھا لیا
وہ اُٹھ گیا شہید کا رتبہ لئے ہوئے

تیرہ شبی میں دے کے ہمیں جلوۂ صباح
رخصت ہوا حفیظ۔ محمد علی جناح
دنیا سے کامرانیٔ عقبیٰ لئے ہوئے

(حفیظ جالندھری)

صدّیقِ دکن

ہزاروں سال کے غلاموں کو جب ہندوستان کی سلطنت ملی۔ تو ان کے حواس بجا نہ رہے۔ ان کی آنکھیں تمام دنیا پر حریصانہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ ان پر جوع الارض کے افسوسناک مرض نے بے پناہ حملہ کیا۔ وہ امریکہ، برطانیہ اور روس کی عظمت و جبروت اور ثروت و جلالت کے خواب دیکھنے لگے۔ انھوں نے "یونائیڈ سٹیٹس امریکہ" کے مقابلہ میں "انڈین یونین" کا ڈھونگ رچایا۔ ہندوستان کی تمام ریاستوں کو مطیع و منقاد بنایا سلطنت حیدر آباد جو ایک آزاد مملکت تھی۔ اور اس کا فرمانروا برطانیہ کا یارِ وفادار تھا۔ بھارت کی چیرہ دستی سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس نے تقسیم کا اعلان ہوتے ہی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ لیکن

بھارت ایک اسلامی ملک کو اپنی سلطنت کے اندر قائم و برقرار دیکھنا کب گوارا کر سکتا تھا۔ اس نے نظامِ دکن پر دباؤ ڈالنا اور اسے اپنا حلقہ بگوش بننے کے لئے مجبور کرنا شروع کر دیا۔

حیدرآباد اگر کسی سرحد پر ہوتا۔ تو بھارت کے حریصانہ حملہ سے محفوظ رہتا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کا محل وقوع ہندوستانی رقبہ میں تھا۔ نہ وہ آزادی سے اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ نہ آئینی یا غیر آئینی طور سے اس کو کسی بیرونی امداد کی توقع تھی۔ تاہم حیدرآباد کے اربابِ لبست وکشاد اس خطرہ سے بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے وقتِ ضرورت کے لئے سامانِ حرب کی فراہمی اور فوجی تیاری کر رکھی تھی۔ مگر سلطنت کے مخلص اور محبِ وطن آزاد اشخاص بھی مدافعتِ وطن کے لئے ہر وقت کوشاں تھے چنانچہ سید قاسم رضوی نے ۵ لاکھ رضاکار سرحدی حملوں کے مقابلہ کے لئے تیار کئے۔

سید قاسم رضوی کون تھے؟ یوپی کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ، ایک قابل ترین قانون دان۔ حیدرآباد دکن کے ضلع عثمان آباد کے صدر مقام لاتور میں مقیم ہو گئے اور وکالت شروع کر دی اور مقامی وکلا میں بہت

جلد نام پیدا کر لیا۔ اس زمانہ میں عثمان آباد سرحدی مقام ہونے کی حیثیت سے آریہ سماج کی تحریک کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آپ نے وہاں ایک پارٹی منظم کر کے اس تحریک کو کچلا۔ قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے جب مجلس اتحاد المسلمین کی اضلاع میں تنظیم شروع کی۔ تو آپ صوبائی مجلس کے صدر منتخب ہوئے۔ جب نواب بہادر یار جنگ نے مجلس اتحاد المسلمین کے لئے پانچ لاکھ روپیہ کی اپیل کی تو سید قاسم رضوی نے تیرہ سو سال کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کی یاد تازہ کر دی۔ انہوں نے اپنا مکان، سامان، روپیہ، جائیداد سب کچھ مجلس کی نذر کر دیا۔ صرف اپنے اور بیوی بچوں کے کپڑے جو بدن پر تھے رکھے۔ اس ایثار سے متاثر ہو کر نواب بہادر یار جنگ نے انہیں "صدیق دکن" کے لقب سے نوازا۔ اور مجلس اتحاد المسلمین کے صدر منتخب ہوئے۔

حیدر آباد کے صدر المہام اس زمانہ میں سر مرزا محمد اسمٰعیل تھے وہ ہندوستان کے ساتھ حیدر آباد کے الحاق کے حق میں تھے۔ سید صاحب نے مرزا صاحب کو اس منصب سے ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ بالآخر ۹ ماہ کے بعد مرزا صاحب حیدر آباد سے تشریف لے گئے اس کے بعد نواب چھتاری صدر اعظم بنے۔ نواب چھتاری

سر والٹن مونکٹن اور سر سلطان احمد جب حیدر آباد کے الحاق کی دستاویز پر دستخط کرنے کے لئے آ رہے تھے تو سید صاحب کے ارشاد پر عوام نے طیارہ ہی روک لیا۔ اُدھر ہندو پاکستان کے قیام کے بعد حیدر آباد نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اور میر لائق علی صدر اعظم اور مجلس کے دو چار ارکان وزیر بنے۔ اب گویا حیدر آباد کی زمامِ حکومت سید صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ اور سرکاری فوج کے علاوہ پانچ لاکھ رضاکاران کے اشارے پر جانیں دینے کے لئے تیار تھے۔ مگر انہیں نظام کا احترام اور سلطنت کا وقار ملحوظ تھا۔ اور وقت کے منتظر تھے۔

ہندوستان کے اربابِ اقتدار اندر ہی اندر سازشوں میں مصروف تھے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کی رات کو جبکہ حضرت قائدِ اعظم کو آغوشِ لحد میں لٹا دیا گیا تھا۔ ہندوستانی افواج "پولیس ایکشن" کے بہانے حدودِ ریاست میں داخل ہوگئیں اور ۱۲ ستمبر کو ہندوستانی افواج نے سترہ اطراف سے حملہ کر دیا۔ ریاستی افواج مقابلہ کے لئے میدان میں نہ آئیں۔ کیونکہ ریاست کا کمانڈر انچیف احمد العیدروس نے غداری کی۔ اور وہ ہندوستانی سازش میں شریک تھا یہ کیفیت دیکھ کر رضاروں کی رگِ حمیت جوش میں آئی۔ اور

وہ مقابلے کے لئے میدان میں نکل آئے۔ ہزاروں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ مگر ان کا جوش و ولولہ کس طرح کامیاب ہو سکتا تھا جبکہ حیدر آباد کا فرمانروا نہرو پٹیل کے آگے سر تسلیم خم کر چکا تھا۔ ولی عہد بہادر ہندو کانگریس کے دامِ تزویر میں اسیر تھے۔ شاہی خاندان لے لبس و معذور۔ کمانڈر انچیف غدار۔ ۱۷ ستمبر کو حیدر آبادی افواج نے معمولی نمائش کے بعد ہتھیار ڈال دیئے اور ۱۹ ستمبر کو سید قاسم رضوی مجلس اتحاد المسلمین کے صدر مقام دار السلام گرفتار کئے گئے۔

تقریباً دو سال سید صاحب کو محبوس رکھا گیا اور عدالتی ڈرامہ کھیلا گیا۔ آخر بتاریخ ستمبر ۱۹۵۰ء کو انہیں شعیب اللہ خاں مدیر "امروز" کے قتل میں اعانت اور بی بی نگر ڈکیتی کے سلسلہ میں عمر قید با مشقت اور مزید سات سال کی قید کی سزا دی گئی۔

یہ سزا غیر متوقع نہیں تھی۔ اگر سزائے موت بھی دی جاتی تو انہیں کون روک سکتا تھا۔ سب سوچی سمجھی بات تھی۔ جج "طوطی در پسِ آئینہ" تھا۔ جو اسے "استادانِ بھارت" نے پڑھایا تھا وہی لکھ دیا۔

دورانِ مقدمہ میں سید صاحب نے جو روش اختیار کی۔ وہ ان کے بلند کردار کی آئینہ دار اور شانِ قلندری کی مظہر تھی انہوں

نے تاریخ میں جو جگہ بنائی تھی بنا چکے۔ ان کا فیصلہ حیدر آباد یا ہندوستان کا کوئی جج نہیں لکھ سکتا۔ ان کا فیصلہ چند سال بعد برِاعظم ہندوستان کی تاریخ لکھنے والا مورخ لکھے گا۔ اور کوئی دیانتدار مورخ انہیں وہ جگہ دینے سے انکار نہیں کر سکتا۔ جو جگہ تاریخ میں اس سے پہلے سلطان ٹیپو کو دی جا چکی ہے

اگر مان لیا جائے کہ قاسم رضوی ہندوستان کے مجرم ہیں۔ مگر یہ جرم اس جرم سے مختلف نہیں۔ جو تیس سال تک انگریزوں کی نظر میں خود پنڈت جواہر لال نہرو کا جرم رہا۔ ان کے والدِ محترم موتی لال نہرو اسی جرم کا ارتکاب کرتے سرگباش ہوئے۔ سید قاسم رضوی نے وہی کچھ کیا۔ جو بہادر شاہ ظفر اور رانی جھانسی نے پہلی جنگِ آزادی میں ہندوستان کے لئے کرنے کی کوشش کی۔ قاسم رضوی نے ان دو مجاہدین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے۔ دارورسن کو دعوت دی۔ افسوس! کہ پنڈت نہرو نے اپنے لئے نکلسن اور لارنس کی راہ پسند فرمائی۔ اور قاسم رضوی کو عمر قید کر کے اپنی حریت پسندی اور آزاد خیالی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

دُعا

یارب! مجھے بیداریِ ہنگامِ سحر دے
نالوں کو رسا کر۔ میری آہوں میں اثر دے
اب اَوج پہ چمکا میری قسمت کا ستارہ
تابانیِ خورشید۔ تجلیِ قمر دے
یورش ہے میری وادیوں میں زاغ و زغن کی
پُر شور فضا ہے۔ مجھے شاہیں کا جگر دے
مستور رہیں مجھ پہ نہ اسرارِ حقیقت
وہ چشمِ بصیرت۔ وہ تجسّس کی نظر دے
محرومِ گل و برگ نہ رکھ شاخِ رجا کو
کر سبز۔ میرے نخلِ تمنا کو ثمر دے
کر وصف عطا دیدۂ گریاں کو صدف کا
بیتاب سرشکوں کو میرے تاب کر دے
پروازِ تخیل ہو میری عرشِ بریں تک
مَیں طائرِ بے بال ہوں جبریل کے پر دے
مایوس نہ جائے تیرے دربار سے فرخ
دامانِ تہی دولتِ اُمید سے بھر دے

(مطبوعہ انشا پریس لاہور)

72

اسلام کے جانباز

فرخ امرتسری

قیمت دو روپے [illegible]

ناشران۔ لائن پریس لاہور